پاکستان کی قومی زبان کا نام

اُردو یا پاکستانی

علامہ ابوالخالد

ملنے کا پتہ :- الطارق

تعمیر(۱) آباد کالونی عقب چودھری کالونی (سمن آباد)

ایک روپیہ پچیس پیسے

پاکستان کی قومی زبان کا نام

اردو
یا
پاکستانی

علامہ ابوالخالد

فاروق کتاب گھر
۳۳- اردو بازار موہن روڈ کراچی

باراوّل ۱۰۰۰ ہزار

قیمت

مطبوعہ امین پرنٹنگ پریس کراچی

مؤلفہ ابوالخالد

پاکستانی قوم کے نام

تعارف

میں جناب علامہ ابوالخالد کی علمی اور ادبی قابلیت کا ہمیشہ سے معترف ہوں۔ میں نے انہیں افکار و خیالات میں منفرد اور ان کے اظہار میں ہمیشہ بے باک پایا ہے۔

کتاب ہذا میں جو بحث اردو زبان کے متعلق کی گئی ہے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اردو و ہندی کا جھگڑا صرف نام کا تھا، یعنی زبان کی تبدیلی نہیں صرف نام کی تبدیلی تھی جسے زبان کی تبدیلی سمجھا گیا۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ اپنے دعوی کو ثابت کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس میں بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ ثبوت ان مصنفین کے حوالہ جات سے بہم پہنچایا ہے جو ہندی یا ہندوستانی اور اردو کو دو مختلف زبانیں خیال کرتے ہیں۔

زبان کا نام اردو سے بدل کر "پاکستانی" قرار دینے کا سوال بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا جس کا فیصلہ خود قوم کو کرنا ہے مصنف

کے دلائل اپنی جگہ اٹل ہیں۔ اسی طرح نسلی اختلاف کا مسئلہ ہے جو اپنی اہمیت کے ساتھ ہی دلچسپی سے بھی خالی نہیں، ملک کے لسانی تجزیہ نے کتاب کو چار چاند لگا دیے ہیں جس سے ملک کے ہر علاقہ کے متعلق آپ کی وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ اکثر علاقوں کی زبانیں مخصوص لب و لہجہ کے ساتھ آپ بے تکلف بولتے ہیں اور ان کے ادبیات سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ غرضکہ آپ کے وسیع علم اور تجربے نے کتاب کو بے حد دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس پر انداز بیان سونے پر سہاگہ سمجھیے، جس نے اس خشک موضوع میں جان ڈال دی ہے۔

میرے خیال میں یہ کتاب ملک کے لیے نئے اندازِ فکر اور ایک تاریخی موڑ کا کام کرے گی

مجھے زیر بحث موضوع سے زیادہ ان کی علمی شخصیت پر لکھنے کی تمنا ہے۔ اس لیے کہ موضوع علمی شخصیت سے ہی اپنا رنگ روپ اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ میرا اظہار رائے اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی تصور فرمائیں ملک کی قومی زبان کا نام ملک اور قوم کی مناسبت سے ہونا چاہیئے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جس سے انکار کی کوئی صورت نہیں جیسے موصوف نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"ملک قوم اور زبان کے ناموں میں اشتراک لازمی امر ہے"

یہ کلیہ کوئی نیا نہیں۔ دنیا کے تمام ملکوں کی زبانوں کے نام اسی کلیہ پر مبنی ہیں۔ لیکن کسی کتاب میں درج نہیں، نہ کبھی زبانی طور پر

کسی کانفرنس یا کسی اجتماع میں زیر بحث آیا، پاکستان کے باہر کسی بھی او
ملک کے باشندوں کے سامنے یہ کہا جائے کہ " ملک قوم اور زبان کے
ناموں میں اشتراک لازمی امر ہے " تو سننے والے یقیناً ہنس پڑیں گے
ممکن ہے کوئی زندہ دل یہ بھی کہہ دے کہ " پھر جناب اس میں کونسی پر
دور کی کوڑی لائے ہیں " یہ ایک اصولی بات ہے اور ایسا کب ہوا ہے
کہ ملک قوم اور زبان کے ناموں میں اشتراک نہیں رہا جو اس اظہار خا
کی ضرورت لاحق ہوئی بلکہ بہت ممکن ہے کہ آپ سے کہا جائے " جناب پھ
اپنا مطلب ذرا واضح طور سے بیان فرمایئے " دوسری کسی قوم کے افر
کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی، کوئی یہ سوچتا پھرے کہ ملک
قوم اور زبان کے ناموں میں مناسبت ہونی چاہیئے اس لئے کہ دنیا میں
کوئی ملک ایسا نہیں جہاں اس کے برعکس ہوتا ہو پھر کسی کو ایسا کلیہ بنا
کی کیا ضرورت اور اس کے متعلق سوچنے کی کیا احتیاج۔ یہ عجوبہ (اب اگ
بھی اسے عجوبہ کہتے ہیں مجبور ہوں) یا تو قبل تقسیم ہندوستان میں تھ
یا بعد تقسیم پاکستان میں پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ابوالخالد صاحب بلا شر
غیرے اس کلیہ کے موجد کہے جا سکتے ہیں۔ جس کے اطلاق سے ہندوستان
تو بچ گیا اس لئے کہ اگر ہندو ملک کا نام بھارت تجویز کرتے ہیں تو زبان او
کا نام بھارتی اور ہندوستان یا ہند تجویز کرتے ہیں تو ہندوستانی
یا ہندی ہو جاتا ہے۔ لیکن پاکستان میں یہ مسئلہ لاریب غور و خوض کا
محتاج ہے۔ امر واقعی تو یہ کہ اس کلیہ کے بعد بحث کی گنجائش ہی نہیں رک

اور یہ ابوالخالد کی علمی شخصیت اور بالغ نظری ہے جس نے سوا سو برس
کے الجھے ہوئے مسئلہ کا دو ٹوک فیصلہ ایک جملے میں کر دیا۔
میں نے ایک خاص بات موصوف میں یہ دیکھی ہے کہ اگر لکھنے
پر آجائیں تو کسی موضوع پر قلم نہیں رکتا۔ مذہبی، معاشی، معاشرتی،
ثقافتی غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو پر بے تکلف لکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ
خاص بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتے ہیں چند احباب کو سناتے ہیں اور
پھر پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں یا آگ کے حوالے کر دیتے ہیں! سولہ
برس کی بے تکلفی میں بھی ان کی اس اپج کو سمجھنے سے قاصر رہا۔
آیئے میں آپ کو بتاؤں کہ سولہ برس کے اس طویل عرصہ میں
موصوف نے کیسے کیسے اہم موضوعات پر قلم فرسائی کی ہے، جو اپنی نوعیت
کے لحاظ سے بے بدل تحقیقی کتابچے پیدا ہو سکتے تھے۔ جن میں "مسلمانوں کی
اقتصادی بدحالی کا قرآنی حل" "اسلام کا پس منظر" جیسے موضوع
بھی شامل تھے جو موصوف کے مجتہدانہ استدلال اور سائنٹفک انداز فکر کا
شاہکار تھے، ایک تمثیل بعنوان "پہلا باغی" ہابیل اور قابیل پر
لکھی، عنوان سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ خط کا مضمون کیا ہوگا۔ ہابیل
اور ابلیس کا مکالمہ انسان کے لاشعور کی عکاسی میں اپنا جواب نہیں
رکھتا تھا اور لطف یہ کہ ابلیس کا ہر جملہ ہابیل کے ضمیر کی آواز تھی اس تضاد
کو نبھانے میں پوری پوری فنکاری برتی گئی تھی۔ دوسری طرف قابیل
کے مکالمے ایک انوکھی شان رکھتے تھے یعنی وہ کوئی بات واضح نہیں کرتا

پھر بھی سب کچھ کہہ جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضبط و تحمل سے کردار کا سینہ پھٹا جا رہا ہے لیکن دامن تحمل نہیں چھوٹتا، مختصر یہ کہ تمثیل زندگی اور ماحول کی جیتی جاگتی تفسیر تھی۔

نظم کا عالم نثر سے بالاتر ہے۔ ایک دوست کی فرمائش پر، جو دربار دکن میں باریاب کرنا چاہتے تھے، شاہ دکن کو ایک قصیدہ لکھا دیہ قصیدہ چند اور شکستہ پاروں کے ساتھ نذرِ آتش ہونے سے بچ گیا ہے، چند اشعار ملاحظہ کیجیے!

قصیدہ جس کا آخری شعر مندرجہ ذیل ہے۔

ہوشیار باش رفت سرور نشاط شام
بیدار باش لذت خواب سحر گذشت

اس شعر کا مصرعہ ثانی ابوالخالد نے بقول خود غالب کے مصرعہ

اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

سے نکالا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں شاہ دکن کو زمانہ کی عادت سمجھنے کی تلقین فرمائی ہے۔

می خوش نکرد ہیچ زماں، ہیچ در قصور
می خوش نہ کرد، ہیچ زماں، ہیچ در قرام!
نگذارد، ہیچ را کہ مرصع کند اطاق!
نگذارد، ہیچ را مطلا کند منام!

نگذارد ہیچ راکہ مشعر کند بساط
نگذارد ہیچ را مکلل کند خیام!
ایں بے مروتے کہ بخشد یہ اسخیا
نشدیدۂ جہانہ مرا آرد سر لیام!
بنگر کہ بردرت چہ زفراست حلقہ زن
پشنو کہ برسرت چہ نفیر است نامرام!
ہوشیار باش رفت سرور نشاط شام!
بیدار باش لذت خواب سحر گذشت!!

قصیدہ کیا ہے اوّل تا آخر ملوکیت سوز آتش فشاں ہے یا پھر فرشتہ وعید کی گرج ہے جو شاہ دکن کو خواب غفلت سے چونکا رہی ہے۔ میں نے صرف چند اشعار کا اقتباس کیا ہے، الفاظ کی تکرار بطور صنعت دس دس بارہ بارہ اشعار میں قائم ہے۔ یہ انداز طرز قدیم کا ہے، اسی انداز پر کسی صدر جلسہ کے لئے بڑے اصرار کے بعد (گوراکردن) ایک تہنیت اردو میں لکھی ہے چند اشعار اس کے بھی ملاحظہ کریں۔

چند شعر جلسہ سے متعلق :-

بساط عجز کا مظہر یہ اہتمام حقیر
کہیں یہ کیسے کہ شایان شان رفعت ہے!
ہمارے پاس ہی کیا ہے بجز متاع خلوص
یہی ہماری گراں مائگی ہے، دولت ہے!

اس شعر کا دوسرا مصرعہ قابل غور رہے۔ ایسے چند اشعار کے بعد گریز ملاحظہ ہو۔

یہ کیا بیاں ہے غرض کیا ہے مدعا کیا ہے
یہ کسی بزرگ کی تمہید ذکر مدحت ہے!
وہ جن کا طالع علیٰ نصیبہ والا
یہ فیض دور زماں مشرف امارت ہے
بجا ہم ان کے نزول شرف پہ نازاں ہیں
اور اس میں کوئی تصنع نہیں حقیقت ہے
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

افسوس کہ پوری نظم لکھنے کا محل نہیں چناں چہ اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔ طنزیات میں بھی نہیں چوکتے۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

زمانہ آج کل ہے "شی" ہیں اور "ہی" میں ملاوٹ کا
عبث کرتے ہو شکوہ گھی میں اور رتی میں ملاوٹ کا
علاج اس کا کسی صورت سے ممکن ہی سہی یارو!
مداوا کس طرح ہو گا مگر "جی" میں ملاوٹ کا

●

طرزِ جدید پر بھی قلم نہیں رکتا۔ ایک نظم "انتظار ساقی"

کے چند اشعار کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

آ بھی جا میکدہ بردوش و بپا لغزشِ ناز
منتظر نوکِ مژہ پر مری جاں ہے ساقی!

ہے تصور ہی تصور میں ترا حسن ہنوز
چشمِ حسرت زدہ نگراں نگراں ہے ساقی!

کتنا رنگین ہوا تجھ سے وفاؤں کا مآل
دجلہ دجلہ لہو ہر گام رواں ہے ساقی!

میں کہ سرشارِ ازل ہوں تو باندازہ ظرف
مجھ پہ کم ظرفوں کو پینے کا گماں ہے ساقی!

لیکن اب جگر تھام کر سنئے کہ ابو الخالد نے ایک دن اس سب کو بمعہ اپنے تیس چالیس سرمایۂ نظم و نثر کے، مٹی کا تیل ڈالکر آگ لگادی مجھے معلوم ہوا، تو واقعہ یہ ہے پہلے ثانیہ میں مجھ پر سکتہ کا عالم تھا استفسار پر، ہنس کر کہہ دیا، پھر لکھ لوں گا۔ میں حیرت سے موصوف کا منہ دیکھتا رہ گیا، میں نے کہا حضرت لکھ تو لیں گے لیکن شائع بھی کریں گے یا کسی دوسرے کو شائع کرنے دیں گے؟ جواب میں ایک زہر خندہ کے سوا اور کوئی بات نہیں تھی۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ اب لکھنے اور شائع کرنے پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ "پاکستان کی زبان اردو یا پاکستانی" آپ کے سامنے ہے۔ اور امید ہے اس کے بعد موصوف کی دوسری تصانیف بھی آپ کو دعوت

فکر دیتی رہیں گی۔ دراصل مجھ سے بڑی غفلت ہوئی مجھے آغاز ہی میں ان سے کام لینے کا ڈھنگ ڈال دینا تھا لیکن میں اپنی ذاتی مصروفیتوں اور پریشانیوں کی وجہ سے قاصر رہا، اور اب میں نے اس کی تلافی، کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

آخر میں محکمہ تعلیم کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ کتاب ہذا کی افادیت کو دیکھتے ہوئے، اسے قومی زبان کے اعلیٰ نصاب میں شامل مستحسن اقدام کیا جائے تاکہ ملک کے نوجوان طبقہ کو اس کتاب سے استفادہ کرنے کا موقع حاصل ہو۔

محمد مقبول الکریم
ایم اے - ایم اے (علیگ)
سابق پروفیسر شعبہ فارسی و اردو ہسلپ کالج ناگپور (ہندوستان)
حال جوائنٹ سکریٹری پاکستان ریپبلک ایجوکیشنل سوسائٹی
ملیر - کراچی

تمہید

میرے محترم و مربی جناب محمد مقبول الکریم صاحب نے تعارف کے تحت بعض ایسی باتیں، مثلاً میرا اپنے لکھے ہوئے کو پھاڑ کر پھینک دینا یہاں تک کہ اپنے تمام قلمی سرمایہ کو جلا دینا وغیرہ، تحریر فرمائی ہیں کہ جن کی وضاحت میرے لئے لازمی ہو گئی ہے لیکن بڑی مشکل کی بات یہ ہے کہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ بقول بلّے شاہ

سچ آکھیاں بھانبڑ مچدا ئے

عجیب مخمصہ ہے اور اسی میں عمر عزیز کا طویل ترین زمانہ گذر گیا لکھنا چاہتا ہوں لیکن ....!!! شاید ان علامات سے میری ذہنی کیفیت کا اظہار ہو سکے۔ سونا حرام، دماغ سے عاجز، سوچنے پر مجبور، لکھنے میں مقہور، لکھتا ہوں پھاڑ دیتا ہوں جلا دیتا ہوں!

با رہ روان پشت بمنزل چساں کنم

آپ کے پیش نظر چند اوراق جو ایک پراگندہ طبع کے پراگندہ

خیالات پر مشتمل ہیں۔ درحقیقت ایک مقالہ کی شکل میں ترتیب دیے گئے تھے، جنہیں کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔ قومی زبان کے مسئلہ کا جو حل میں نے پیش کیا ہے وہ ملک کے محل و قوع کی بنا پر کسی حد تک الجھن کا باعث ضرور ہے لیکن حب الوطنی کے جذبہ کے سامنے اس الجھن کی حیثیت ثانوی ہونی چاہیئے۔

میرے خیال میں قومی زبان کا مسئلہ تاہنوز حل طلب ہے، ملکی اور قومی سالمیت آج بھی اہل ملک کی طرف بحسرت نگراں نگراں ہے۔ اس سرزمین پر سانس لینے اور خورد و نوش کی ضروریات پوری کرنے کے بعد، اس کی بھلائی اس کا امن، اس کی ترقی اس کی خوشحالی کی چاہت میرے لئے بھی قدرتی امر ہے، اس لیئے میں نے سترہ برس تک حالات کا اندازہ کر کے ناچار اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

واضح ہو کہ زبان کے لیئے لفظ اردو سے بھی انگریزوں نے اپنی سیاسی بازیگری میں بڑا کام لیا ہے۔ انگریزوں نے دو ڈھائی سو برس کے دورِ حکومت میں جو گل ہندو پاکستان میں کھلائے ہیں اُن کے نتائج ان دونوں ملکوں کو عرصۂ دراز تک بھگتنے پڑیں گے۔ محکوم اقوام کو برباد کرنا ان کی علمی، عملی جسمانی ذہنی صلاحیتوں کو فنا کرنا۔ انگریزی سیاست کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اور اس معاملہ میں انگریزوں کا کمینہ پن جسے وہ سیاست کا نام دیتے ہیں۔ تاریخ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتا خاصکر مسلمانوں کے ساتھ جو رویہ انگریزوں کا رہا بیان کرنے کی قلم اجازت

نہیں دیتا۔ مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف انگریزوں نے بلکہ یورپ کی اس سفید فام قوم نے جس کو مسلمانوں پر دست رس کا موقع ملا، ذلیل سے ذلیل سلوک کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ حالانکہ مسلمان ہی وہ قوم ہے جس کے سامنے یورپین اقوام نے زانوئے ادب تہہ کیا اور ان سے علوم و فنون کی روشنی حاصل کی ہے۔ پھر استادوں کے ساتھ ایسا ناروا رویہ ان کا ہی ظرف ہے۔ دوسری کوئی قوم اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک ان سے واپس لینے کے بعد انہیں ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہیں باقی رکھی میرے اس بیان کو موضوع سے غیر متعلق نہ خیال کریں، واضح رہے کہ اسلام، مسلمان اور یورپین اقوام میں خاصکر انگریز، تاریخ عالم کے ہر سیاسی، معاشرتی معاشی، تمدنی، تہذیبی تغیر و انقلاب کے تین محور ہیں جن کے مدار پر تمام دنیا کی تاریخ گردش کرتی رہی ہے۔ اگر وقت نے ساتھ دیا تو اس کا انکشاف بھی کیا جائے گا۔

ہندوستان میں اورنگ زیب جیسے پرہیزگار کو ہندوؤں کے معاملہ میں سخت گیر اور ظالم ثابت کیا اور ایسے ایسے بے بنیاد واقعات اس کی ذات سے منسوب کئے کہ جنہیں سنکر خواہ مخواہ اشتعال پیدا ہو تربیت یافتہ افراد سے ہندو مسلمانوں میں فساد کرائے۔ پھر فساد زدہ علاقوں میں کہیں مسلمانوں کا پلّہ بھاری رکھا کہیں ہندوؤں کا چنانچہ دونوں قومیں انگریزوں کی سلامتی میں اپنی سلامتی سمجھتی رہیں

اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے سے قاصر رہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو اتحاد انگریزوں کے مشاہدہ میں آیا تھا اس کا توڑ ان کی سیاست کا پہلا قدم ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ ایک طرف تو مسلمانوں کی تاریخی حیثیت مسخ کر کے پیش کی گئی دوسری طرف 'اردو' ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا گیا۔

'ہندی یا اردو' کو جو ایک ہی زبان تھی دو علیحدہ زبانیں قرار دیکر دونوں قوموں کے درمیان منافرت کی وہ خلیج پیدا کر دی کہ جس کا پاٹنا ناممکن ہو گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو پاکستان کا مطالبہ کرنا پڑا۔ جس کے قیام کے چند سال بعد ہی اردو اور بنگالی سوال پیدا ہو گیا اور پھر جو کچھ ہوا اس کا تمام اہلِ ملک کو علم ہے۔

اردو پر تاریخی اور تحقیقی تنقید کیے بغیر بھی دلائل سے یہ بات ثابت کی جا سکتی تھی کہ ملک قوم اور زبان کے ناموں میں اشتراک لازمی امر ہے، لیکن اردو سے جو عقیدت پاکستان کے مسلمانوں، خصوصاً باشندگان دہلی اور لکھنؤ میں پائی جاتی ہے، اس کلیہ کو تسلیم کرنے کے بعد بھی انہیں اس لفظ کو چھوڑنے نہیں دیتی اور وہ اس اقدام سے جھجک محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ سترہ برس میں جہاں کہیں بھی تبادلۂ خیال کا موقع ہوا، یہی جواب ملا کہ دلائل تو آپ کے درست ہیں لیکن لفظ اردو

کو اس کلیہ سے مستثنا قرار دیا جا سکتا ہے، پھر بہت سی پیچیدگیاں رکاوٹیں اور الجھنیں پیش کی جاتی رہیں۔ مختصر یہ کہ لفظ اردو کے چاہنے والے اس امر پر رضامند ہوتے نظر نہیں آئے کہ زبان کا نام اردو سے بدل کر، پاکستانی، کر دیا جائے۔ اس لئے مجبور ہو کر مجھے اس لفظ کی تاریخی حیثیت کو زیر بحث لانا پڑا ہے۔

بعض حضرات نے ایران کی مثال پیش کی یعنی یہ کہ، ملک کا نام ایران ہے اور زبان کا نام فارسی جو مدت سے رائج ہے، ممکن ہے کوئی اور محترم بھی یہ دلیل پیش کریں، چنانچہ میں یہاں اس الجھاؤ کو دور کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں۔ رشیدی، شرفنامہ، برہان اور رسالہ ناجی کے مطابق فارسؔ ایران کے صوبہ کے نام پارتھیا سے نکلا ہے اس طرح کہ پہلے پارتھیا سے پارس ہوا اور پارس سے عربوں نے فارس بنا لیا۔ صوبہ پارتھیا کسی زمانہ میں زیادہ مشہور تھا جب اس کا نام پارس ہوا تو زبان پارس کہلائی اور آج بھی پارسی قوم دنیا میں اپنے زرتشتی عقائد کے ساتھ موجود ہے جس کی زبان پارسی کہلاتی ہے بلکہ ایرانی مسلمان بھی اکثر فارسی کی جگہ پارسی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ عربوں نے پارس کو معرب (عربی بنانا) کر کے فارس قرار دیا اور زبان کا نام فارسی ہو گیا جسے رائج ہوئے صدیاں گذر گئیں اہل ایران نے اس خصوص میں کبھی صوبائی یا علاقائی تعصب سے کام نہیں لیا۔ عراق، ہمدان، نہاوند، کرمان، مازندراں، آذربیجان، طبرستان، تا خراساں تمام علاقوں کے باشندے

اس نام سے ذرہ برابر عزیت ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

لیکن اردو کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے جیساکہ میں پہلے تحریر کرچکا ہوں۔ زبان کے لئے یہ لفظ ہندوستان میں بھی بڑے بڑے شہروں تک محدود تھا دور دراز کے دیہاتوں میں زبان کے لئے لفظ ہندوستانی استعمال ہوتا تھا اس لئے کہ زبان کے نام بطور اس لفظ کو رائج ہوئے کوئی پونے دوسو برس کا عرصہ گذرا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قلیل مدت میں یہ لفظ ایسے علاقوں میں کیونکر رواج حاصل کرسکتا تھا۔ پھر جبکہ مسلمانوں نے کبھی اس بات کی کوشش بھی نہیں کی کہ دیہات میں اردو کی نشرواشاعت کا انتظام کیا جائے، ظاہر ہے اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا جو ہوا۔

قیام پاکستان کے سترہ برس گذر جانے کے بعد آج بھی پاکستانی دیہات کا وہی عالم ہے جو اٹھارہ انیس برس قبل تھا۔ لفظ اردو ابھی تک علاقائی اثرو نفوذ حاصل نہیں کرسکا۔ ادھر ملک میں تاہنوز علاقائی عصبیت موجود ہے۔

ان حالات میں ایران یا کسی اور ملک کی مثال سے ہم پر یہ امر کیونکر لازم آسکتا ہے کہ ہم ان مفادات کو نظرانداز کردیں جو ایران یا کسی اور ملک کو اس کلیہ پر عمل پیرا ہوئے بغیر ہی حاصل ہیں، اور دلیل یہ پیش کریں کہ ایران کی زبان کا نام چونکہ ملک اور قوم کے نام سے مناسبت نہیں رکھتا اس لئے پاکستان میں بھی لفظ اردو کو قومی زبان کے نام بطور استعمال کرنے میں کیا قباحت ہوسکتی ہے۔

گذشتہ ایک سو برس میں لسانی افتخار کا جو مفہوم لفظ اردو نے اذہان میں پیدا کیا، اس کے نتیجے میں پشاور سے کلکتہ تک اور شمالی ہند سے دکن تک مسلمان حسد، نفرت نیز کمتری اور برتری کے احساس کا شکار ہو گئے۔ بلاشبہ دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا معیار پیدا کرنا دوسروں کے لیے مشکل تھا، چنانچہ دوسرے شہروں کے بڑے بڑے باکمال کھیں نکال کر زبان کے معاملہ میں اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھے گئے، یہ شکست تحت الشعوری طور پر لسانی تفوق کے مناقشہ میں تبدیل ہو گئی۔ ڈاکٹر محی الدین زورؔ پر لکھنے والوں کی تحریریں اس جذبہ کی غمازی کرتی ہیں۔

مختصر یہ کہ لفظ اردو نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تو پھوٹ ڈالی ہی خود مسلمانوں میں بھی اہل زبان اور غیر اہل زبان کا تفرقہ پیدا کر دیا، انگریزی سیاست نے ان میں جو ہندوستانی، پنجابی، سندھی تنافر پیدا کیا تھا۔ اسے لسانی تفوق کے احساس، اور اس کے توڑنے نیم چڑھا کر بلا بنا دیا۔ دعوی داران اخوت علاقائی اور نسلی تعصبات کا شکار ہو گئے۔ گمراہ انگریزی ذہن نے متانت اور سنجیدگی کا خاتمہ کر دیا۔ "کلرکی کرنے اور ڈبل روٹی کی طرح پھولنے" کے سوا اور کوئی فکری یا علمی کام تو تھا نہیں، احباب کی محفلیں چرب زبانی اور پھکڑ بازی کے اکھاڑے بن گئیں، غیر زبانوں پر پھبتیاں نوک جھونک اشارے کنائے یاران محفل کی دلچسپی کا سامان بن گئے۔ دوسری طرف سے لکھنؤ کے کنکوے، جیسی اصطلاحیں

وضع کی گئیں اور اس طرح الھڑ اور بھٹکے ہوئے نوجوانوں کے سامنے،

کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

کی صدا نقار خانے میں طوطی کی صدا ثابت ہوئی۔ علاقائی کھچاؤ عصبیت کے دوسرے عوامل پر لسانی عصبیت مستزاد ہے جسے اولین فرصت میں ختم کرنا چاہیئے۔ جس کا واحد علاج یہ ہے کہ ملک میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی علمی و ادبی نیز مشترکہ کاروباری زبان کا تسمیہ "پاکستانی" قرار دیا جائے تاکہ علاقائی اور نسلی کشیدگی میں کمی واقع ہو اور مستقبل کے لیئے قومی سالمیت کے امکانات روشن تر ہوتے جائیں۔ لسانی اس مستقبل میں تمام علاقائی اقوام کی ایک مخلوط نسل کی نشو نما اور بار آوری کا ضامن ثابت ہو۔

ابوالخالد

دسمبر ۱۹۶۴ء

پاکستان کی قومی زبان کا نام

اردو
یا
پاکستانی

"مرا شوریست اندر دل اگر گویم زباں سوزد

دگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

"ملک قوم اور زبان کے ناموں میں اشتراک لازمی امر ہے"

تقریباً تیس برس کے عرصہ سے یہ خیال میرے ذہن میں ایک خلفشار بن کر جاگزیں ہے۔ ۱۹۳۵ء تک اس کی شدت کا زمانہ تھا اس کے بعد حالات اور ساتھ ہی مشاغل زندگی کی نوعیت بدل جانے سے مدہم پڑتے پڑتے تقریباً ذہن میں دب کر رہ گیا۔

۱۹۳۰ء کا ذکر ہے جبکہ رہائش کوئٹہ میں تھی، میں ایک دن اپنے گھر کے کتبخانے میں ایک خریطہ کو الٹ پلٹ کر رہا تھا جس میں جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء سے متعلق بہت سی قلمی تحریریں تھیں کہ میری نظر سے مندرجہ ذیل تحریر گذری۔

ں فتنۂ عظیم لفظ اردو نہ خامہ بسیار رہتصمہ
است باید کہ ملہ بدبختیٔ مسلمانان، ہندوستان کنتہ می شود
خیول ین فقیر حقیر سلمانا ر نباید لہ ود رایہیچ وجہ دین گ زگی
بیالہ ینہ - الاینکہ بدبختی برسرشا مقسوم شد شد - حلوم میشد لہ
بعی ار یرزابان دہلی بعوص چند سلہائی سقرہ بن خامت قیامت آثار
برسر سلمان این دیار سلط خواہند کرد۔ تفو ں تفو۔ باکہ
شو ی برائی تسمیہ بان سفظ ہند ستانی راترجیح دادہ باشند۔ چہ اسراک ر
تسمیہ ملک و قوم وز ن شر الیست کہ خلاش حلاف عقلا باشد"

کاغذ نہایت بوسیدہ اور کرم خوردہ تھا اس لیے جگہ جگہ سے الفاظ کٹے ہوئے تھے۔ میں نے اسے ایک دوسرے کاغذ پر چسپاں کر کے اس کے متعدد چربے اتارے اور سب علیحدہ علیحدہ درست کر کے والد بزرگوار کو دکھائے ان میں جو انھوں نے صحیح قرار دیا درج ذیل ہے۔

ایں فتنۂ عظیم لفظ اردو کہ وخامت بسیار را متضمن است باید کہ تکملۂ بدبختیٔ مسلمانان ہندوستان گفتہ می شود۔ درخیال ایں فقیر حقیر مسلمانان رانباید کہ خود را بہیچ وجہ دریں گندگی بیالایند۔ الّا اینکہ بدبختی برسرشان مقسوم شدہ باشد۔ معلوم می شود کہ بعضے از میرزایان دہلی بعوض چند سکہائے نقرایں وخامت قیامت آثار برسر مسلمانان ایں دیار مسلط خواہند کرد۔ تفو برتو اے چرخ گرداں تفو۔ باید کہ شورئ برائے تسمیہ زبان لفظ ہندوستانی را ترجیح دادہ باشند۔ چہ اشتراک در تسمیہ ملک و قوم و زبان اشترکیست

کہ خلافش خلاف عقل باشد۔

اس تحریر کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہوگا۔

"یہ فتنہ' عظیم لفظ اردو (جو) کہ بہت بڑی خرابی کا متضمن ہے' لازم ہے کہ (اسے) ہندوستان کے مسلمانوں کی بدبختی کا تکملہ کہا جائے۔ اس فقیر حقیر کے خیال میں مسلمانوں کے لئے (یہ) مناسب نہیں ہے کہ (وہ) خود کو کسی وجہ سے بھی اس گندگی میں آلودہ کریں۔ سوائے اس کے کہ بدبختی ان کے سر پر مقدر ہو چکی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے بعض میرزا، چند نقرئی سکوں کے عوض یہ قیامت آثار خرابی اس ملک کے مسلمانوں کے سر پر مسلط کرنا چاہتے ہیں شوری کو لازم ہے کہ زبان کے تسمیہ کے لئے لفظ ہندوستانی کو ترجیح دیں اس لئے کہ ملک قوم اور زبان کے تسمیہ میں (اشتراک، ایسا اشتراک ہے جس کے خلاف (عمل کرنا) خلاف عقل ہوگا"۔

اس زمانہ کی سیاسی فضا[1] اور اس میں مسلمانوں کی حالت جو اس تحریر کی روشنی میں نظر آسکتی تھی، جبکہ وخامت قیامت آثار کی تیاری بڑے زور و شور سے ہو رہی تھی، اس پر والد بزرگوار کی تصریحات جو انگریزوں کی سیاست کے سمجھنے میں بڑے ماہر تھے، میرے لئے ایک ذہنی کرب پیدا کر گئیں۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ "ملک، قوم اور زبان کے ناموں میں اشتراک

---

[1] جو ہندوستان پر خاطر خواہ تسلط حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کی کم و بیش دو سو سالہ بازیگری کا نتیجہ تھی۔

لازمی امر ہے " عنوان قرار دیکر مقالہ جات لکھنے کا ایک سلسلہ قائم کیا جائے جس کا مقصد ہندوستان کی زبان کا تسمیہ "ہندوستانی" قرار دینا ہو۔ چنانچہ میں نے یہ مقالہ ترتیب دیا اور والد بزرگوار کو سنایا" آپ نے اسے اشاعت کے لئے بھیجنے اور اس کے علاوہ ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے کی سخت ممانعت کردی، بہت سی باتیں بتائیں جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہمارا کاروباری تعلق براہ راست انگریزوں سے تھا اور ہم ہر وقت اعلیٰ حکام کی نظروں کے سامنے رہتے تھے اس لئے اس کی اشاعت ہمارے حق میں مضرت رساں ثابت ہوگی ناچار مجھے اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ یہ مقالہ میں ایک کتاب میں رکھ کر بھول گیا اس کے بعد کاروباری مصروفیتوں میں مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ ۱۹۳۴ء میں کوئٹہ میں زلزلہ آیا اس میں تمام کاروباری ساکھ اور تمام خاندان تباہ ہوگیا۔ اس تباہی سے میری طبیعت اس قدر مضمحل ہوئی کہ پاکستان کے قیام تک میں نے ذہنی عزلت گذینی کی زندگی گزاری کوئٹہ کے حادثہ سے جو علمی سرمایہ بچا تھا وہ پاکستان کے حوادث کی نذر ہو گیا۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو

۱۹۴۰ء میں بعض حالات کی بنا پر مجھے مستقل طور پر دہلی کی سکونت اختیار کرنی پڑی، مولوی عبدالحق اس وقت حیدر آباد سے آکر دہلی اجمیری گیٹ میں مقیم تھے ایک دن نہ جانے کیا خیال آیا کہ میں مولوی صاحب سے ملنے جا پہنچا اتفاق سے اس وقت مولوی صاحب تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ رسمی تعارف کے بعد کچھ توقف سے میں نے ہندوستان کے لسانی قضیہ پر سلسلۂ گفتگو کی تمہید کردی۔

مولوی صاحب چونکنے سے ہو کر بیٹھ گئے اور بڑے غور سے میری باتیں سنتے رہے۔ میرے خیالات میں یکسر اختلاف مولوی صاحب کے لئے بلا شبہ حیرت کا باعث ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے مجھے قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں مطمئن نہ ہو سکا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کی گفتگو کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کھسیانے سے ہوتے جا رہے ہیں۔ استدلال کی جگہ استہزاء، غیر متعلقہ اور دفع الوقتی کی باتیں کرنے لگے ہیں جبکہ میں بالکل متانت سے مسئلے کے ہر پہلو پر بحث کرنے کے لئے (اپنے موقتی ذہن کے خلاف) آمادہ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر کار انکار ما فی الضمیر ظاہر ہو ہی گیا میرے ایک اعتراض پر جز بز ہو گئے، فرماتے ہیں،

"میاں صاحبزادے کے آمدی کے بیر شدی اردو زبان ہر کس و ناکس کے گون کی نہیں، فارسی پڑھاتے ہو بڑھائے جاؤ اس زبان کے مسائل میں پڑ کر وقت ضائع مت کرو" (میں اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضلین وغیرہ امتحانات کی تیاری کرا رہا تھا) اس کے جواب میں کیا کہا جا سکتا تھا، مولوی صاحب سے نہیں مجھے ...... سے سخت مایوسی ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوتے ہی میں کراچی آگیا۔ زبان کے تسمیہ سے متعلق یہاں بھی کم و بیش وہی مسائل موجود تھے، چنانچہ اردو بنگالی قضیہ کا المیہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس واقعہ کے رونما ہونے سے ایک مرتبہ میرے خیالات میں پھر حرکت پیدا ہوئی لیکن لفظ اردو سے متعلق وہ تاریخی مواد جو مجھے ۱۹۳۰ء میں حاصل ہوا تھا، میرے خیال میں کوئٹہ کے زلزلہ میں ضائع ہو چکا تھا، دوسرے ذرائع مفید مطلب نہیں تھے۔ چناں چہ اس موضوع پر

لکھنے یا بولنے سے مایوس ہو کر خموشی اختیار کر لی۔ کچھ دن ہوئے میں ایک مسئلہ کی تحقیق کے لئے ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ کتاب کوئٹہ کے زلزلہ اور پاکستان کے حوادث سے بچ گئی ہے، کہ اس کے اوراق میں مجھے ۱۹۳۰ء کا لکھا ہوا یہ مقالہ مل گیا جسے پا کر مجھے بے حد خوشی ہوئی چناں چہ اس کا کچھ حصّہ موجودہ مقالہ کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ یہ بات اس لئے بھی ضروری تھی کہ مرقومہ ماقبل فارسی تحریر پر ہی میں نے اس نظریہ کی بنیاد رکھی ہے۔:-

"قوم ملک اور زبان کے ناموں میں اشتراک لازمی امر ہے"

اردو ہندی جھگڑے سے اب ہمیں کوئی سروکار نہیں (مولوی صاحب کے قول کا اعادہ ہے صرف الفاظ میں تبدیلی کی گئی ہے) اور اس کے مضرات و عواقب سے بھی ہم گزر چکے ہیں جن کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ اس لئے بہت کچھ ردو بدل کرنی پڑی چناں چہ ان عواقب و مضرات کی تفصیلات سے متعلق تمام حصّہ خارج کر دیا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں اس موضوع پر معلومات بہم پہنچانا کار ے دارد والی بات تھی جنگ آزادی سے متعلق جو تحریریں مجھے اپنے گھر کے کتب خانے سے ملیں تمام تر دارو مدار ان پر ہی رکھا گیا تھا اس کے بعد جو ادب اس موضوع پر سامنے آیا اس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں قارئین خود اندازہ لگائیں کہ یہ کیا انداز ہے۔ مثلاً مشتے نمونہ از خروارے "فلاں صاحب کی کتاب "ہندوستانی زبان" اردو کے قواعد پر شائع ہوئی کتاب کا نام ہندوستانی زبان اور شائع ہوئی اردو کے قواعد پر "پرانی اردو (یعنی ۱۷۴۷ء کی اردو) میں "نے" کا استعمال نہیں ہوتا تھا" گویا ۱۷۴۷ء کی زبان اردو کہلاتی تھی۔" ان کی

(جان گل کرسٹ) کتاب قواعد اردو ۱۸۰۹ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ لیکن اس کتاب کے سرِ ورق پر اس کتاب کا نام انگریزی حروف میں ہندوستانی زبان کے قواعد لکھا ہے۔ "ہریانوی کوئی علیحدہ زبان نہیں ہے بلکہ وہی پرانی اردو ہے جو ۱۱۰۰ھ مطابق ۱۶۸۶ء میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے اگر ہم اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے" مطلب یہ کہ ہریانی قدیم اردو ہے یا اس کی شاخ !!! مثلاً اگر یوں کہا جائے کہ عبرانی کوئی علیحدہ زبان نہیں ہے وہی قدیم عربی ہے اس میں اور عربی میں بہت کم فرق ہے اگر ہم اس کو عربی نہ مانیں تو عربی کی شاخ ماننے میں تو ہمیں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے تو کامل شرافت سے جواب ہونا چاہیئے۔

ہر سخن آپ کا بجا ارشاد

اور اپنی خیریت منانی چاہیئے۔

یہ اندازِ بیان مبتدیوں اور غیر ملکیوں کو قومی زبان پڑھانے میں جس قدر الجھن اور شرمندگی سے دوچار کرتا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہیں اس موضوع سے حقیقی معنوں میں دلچسپی اور تحقیقی ذوق ہے مختصر یہ کہ تمام مصنفین نے لفظ اردو کا استعمال اس طرح کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا تسمیہ زبان کی ابتدار کے زمانہ سے ہی رائج ہو گیا تھا۔

تاہم اس وقت تک جو ادب اس خصوص میں پایا جاتا ہے اس کے مطالعہ سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس میں میرے اندازِ فکر کی جو چنگاریاں دبی

دبی نظر آئیں ہیں میں نے اس "نالۂ آتش ناک" کی سوزش کو تیز تر کرنے کے لئے اس کے شعلوں میں ملفوف کر دی ہیں۔

میں نے اس مقالہ کی باز ترتیب میں مندرجہ ذیل تصانیف سے استفادہ کیا ہے ان کے مصنفین کا میں بے حد ممنون ہوں۔ مقدمہ قواعد اردو، وخطبات مولوی عبدالحق، دکن میں اردو نصیرالدین ہاشمی، پنجاب میں اردو حافظ محمود خاں شیرانی۔ ڈاکٹر محی الدین زور نمبر مطبوعہ دکن۔ قواعد زبان اردو مشہور بہ رسالہ گل کرسٹ مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی۔

مرقومہ ماقبل فارسی تحریر کے مضمرات کس قدر لرزہ خیز ہیں ان تمام کی تفصیل جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اس مقالہ سے خارج کر دی ہے تاہم زیر بحث مسئلہ میں ضروری استفادہ ضرور کیا ہے، جو اس تحریر کے علاوہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس تحریر کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:-

۱۔ میرزایان دہلی سے قبل کسی مصنف نے لفظ اردو کو زبان کے نام کے لئے استعمال نہیں کیا۔

۲۔ زبان کے نام کے لئے لفظ اردو کے استعمال کی ابتدا میرزایان دہلی نے کی۔

۳۔ ان میرزایان دہلی نے یہ کام چاندی کے چند سکوں کے عوض انجام دیا۔ اس نام کا رائج ہو جانا، مسلمانوں کے لئے بہت بڑی خرابی کا باعث ہوگا۔ جو قیامت سے کم نہیں ہوگی۔

اُمیر زایان دہلی سے قبل کسی مصنف نے لفظ اردو کو زبان کے نام کے لئے استعمال نہیں کیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میرزایان دہلی سے قبل اس ملک کی زبان کس نام سے مشہور تھی، اس کا آغاز کب ہوا اس کی وجہ تسمیہ کیا تھی کیا وہ تسمیہ ملکی حیثیت رکھتا تھا یا نہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد و بحیثیت تجار ایک مسلمہ اور قدیم تاریخی حقیقت ہے، ظاہر ہے کہ سمندری آمد و رفت سے اس ملک کا مغربی ساحل اثر پذیر ہوا ہو گا جو کراچی یا کچھ اور پر کے ساحل سے لے کر جزیرہ لنکا تک ہو سکتا ہے۔ خشکی کے راستہ یہ آمد و رفت، خلیج فارس کو عبور کرنے کے بعد سندھ کے علاقہ کو متاثر کر سکتی ہے۔ چنانچہ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ دکن اور سندھ سے اس ملک کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں کا میل جول شروع ہوا اور ایک مخلوط زبان کی بنیاد پڑی دوسری طرف پنجاب میں سرحدی دروں کے راستے بھی مسلمانوں کی آمد کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں یکتائے روزگار صوفی منش مسلمانوں کی آمد اس سرزمین پر آج بھی نقش و دوام بزبان حال،

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

.... کا منظر پیش کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ تاجروں کی آمد نے کاروباری زبان پیدا کی ہو گی اپنے اخلاق سے مقامیوں کو متاثر کیا ہو گا واضح ہو کہ اُس زمانہ کے مسلمان تاجروں کے اخلاق پر اِس زمانہ کے مسلمان تاجروں کے اخلاق سے قیاس کرنا بڑی شدید غلطی ہو گی۔ ان کی تجارت میں سود حرام تھا نفع کی شرح استحصال سے ناآشنا تھی اس پر بھی وہ یہودیوں جیسی قدیم سود خوار اور

تجارت میں ماہر قوم کو شکست دے کر تمام دنیا پر چھلائے جا رہے تھے) ان تاجروں کے اثرات کے ساتھ ساتھ بزرگان دین نے بھی علمی ادبی اخلاقی اثرات پھیلائے ہوں گے۔ یہ صوفی منش بزرگ اپنے مشن میں کیسے کامیاب تھے خود ہندوؤں کی ان سے عقیدت اس کی وضاحت کے لئے کافی ہے (یہاں تک کہ مسلمان حکمرانوں سے بھی ہندوؤں کی محبت، کا پتہ چلتا ہے۔ چناں چہ تاریخ بتاتی ہے کہ محمد بن قاسم جب اس ملک سے واپس ہوا تو ہندوؤں نے اسے روتے ہوئے رخصت کیا حالانکہ محمد بن قاسم اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تھا) ان بزرگوں نے اسلامی معاشرت (موجودہ نہیں) کی خوبیاں پیش کی ہوں گی انسانی مساوات کی تلقین کی ہو گی۔ یہ باتیں اس زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھیں لازمی طور پر مقامی باشندے خاص کر پس ماندہ اور ستائے ہوئے لوگ ان سے اثر پذیر ہوئے ہوں گے۔ آپس میں نشست و برخاست، خلا ملا، حال وقال کی محفلیں جمی ہوں گی ان سب باتوں کے نتیجے میں مسلمانوں کے لشکری حملوں کے ذریعہ اس ملک پر قبضہ کرنے سے بہت پہلے ایک مخلوط زبان کا پیدا ہو جانا یقینی امر ہے۔

اب رہا اس زبان کے نام کا مسئلہ، تو یہ ملک عرصۂ دراز سے ایک ایسے ملکی تسمیہ سے محروم تھا جو ملک کی کل علاقائیت کا کوئی وحدانی تصور پیش کر سکتا اور کل ملکی تسمیہ کا ضامن ہوتا۔ ملاحظہ ہو انسائکلو پیڈیا برٹینیکا صفحہ ۱۵ کی انگریزی عبارت جس کا ماحصل یہ ہے " اس ملک کے لئے مشکل سے ہی کوئی ایسا نام تحقیق کیا جا سکتا ہے جو کل ملکی تصور کا حامل ہو، لفظ

ہندوستان جو ایک زمانہ میں یورپ کے ماہرین جغرافیہ نے اختیار کیا تھا صرف جزیرہ نمائے ہند کے اس علاقہ کے لیے استعمال ہوتا تھا جو بند صاجل کے شمال میں واقع ہے۔یا دریائے گنگا کے بالائی طاس تک۔اس کا اطلاق ہو سکتا تھا چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جیسی عظیم کتاب بھی اس لفظ کی وجہ تسمیہ بتانے کے معاملے میں خاموش ہے۔بھارت ورش۔اگر "بھارت" کسی راجہ کا نام فرض کر لیا جائے تو "ورش" کی ترکیب سے معنی ہوں گے "بھارت کا زمانہ" اس لیے کہ "ورش" برس کا سنسکرت تلفظ ہے اور زمانہ کے معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے یہ نام سورج بنسیوں اور چندر بنسیوں کے زمانہ یا کچھ بعد تک خیال کیا جا سکتا ہے جس کی حدود کا متعین کرنا غیر ممکن۔ سکندر کے حملہ کے وقت "ٹکسلا اور پنجاب کے نام سے ایک محدود علاقہ موسوم نظر آتا ہے اس سے زیادہ کسی بات کا پتہ نہیں چلتا۔جس طرح ملک اتر دیش دکھن دیش پوروپ دیش پچھم دیش کی جغرافیا ہیئتوں یا پھر سیاسی وحدتوں مثلاً راجستھان، قنوج، برج اودھ وغیرہ میں بٹا ہوا تھا۔اسی طرح زبان بھی اتری دکھنی۔پوربی پچھمی۔راجستھانی۔قنوجی۔اودھی۔ہریانی وغیرہ کے ناموں میں بٹی ہوئی ہو گی۔ذات پات کے بندھنوں کا اثر زبان پر ہو گا۔سنسکرت اُتم ذات والوں کی زبان ہو گی پراکرت یعنی مقامی بولیاں اڑیا تلنگو تامل دراوڑی بھیلی گونڈی وغیرہ مدھم ذات والوں کی بولیاں ہوں گی۔غرض یہ کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس سرزمین کے ملک گیر نام کا ہی پتہ نہیں چلتا تو زبان کا نام کیا معنی!

نام یا اسم جس سے ہم کسی شے کا تسمیہ کرتے ہیں بنیادی اہمیت کی چیز ہے

کائنات میں ایک شے بھی ایسی نہیں جس کے تسمیہ میں انسانی ذہن کی کرشمہ سازی کارفرما نہ ہو۔ ہر اسم کے پیچھے انسانی تاریخ کا ایک دفتر پوشیدہ ہے اور انسان کے ماضی کے خوابیدہ افسانہ پر ایک پوشش کا کام کر رہا ہے۔ آپ اس پوشش کو چاک کریں۔ (لفظی تجزیہ) پھر دیکھیں کیسے کیسے سہانے اور ڈراؤنے مناظر آپ کے سامنے آتے ہیں۔ اس طریقہ سے ماضی کا پتہ چلانے میں مدد لی جا سکتی ہے مفردات کے معاملے میں تو بے شمار دقتیں ہیں۔ تاہم مرکبات اتنے پیچیدہ نہیں۔

آیئے چند ایک مناظر میں آپ کو دکھاؤں۔ وہ دیکھئے قدیم بابلی تہذیب کا دور دورہ ہے۔ لوگ ایک نازک اندام حسین مجسمہ پر پھول چڑھا رہے ہیں بخور جلایا جا رہا ہے، نفیریاں اور شہنائیاں الاپ رہی ہیں، ڈھول گونج رہے ہیں۔ عورتیں مرد رنگ و بو میں غرق دیوی کی پوجا کے لئے ٹوٹ پڑے ہیں یہ استارہ دیوی ہے، جو روایت کے مطابق آسمان پر چلی گئی تھی اور آج انسانوں کی بہت بڑی اکثریت اسم ستارہ اور اسٹار استعمال کر رہی ہے ضمنیات کے اور ایسے ہی منظر کا تصور کریں جس میں آپ کو آگسٹس دیوی (یونان) نظر آئے گی۔ پھر آپ شاہ آگسٹس کو دیکھیں گے پھر آپ کو اس کی تمام فوج صحرائیوں کے فن جنگ کا لقمہ بنتی نظر آئے گی، اس سانحہ کی یادگار میں آج آپ لفظ اگست ایک انگریزی مہینے کے نام بطور استعمال کر رہے ہیں، اور دیکھئے ایک خیام صورت بزرگ گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے ہیں، معتقدین میں گھرے ہوئے، فیثا غورث کے نظام ہیئت پر درس ہو رہا ہے۔ زمین ساکن ہے اور یہ نیلی نیلی فضا گھومتی ہے اور اس کے ساتھ ہی تمام ستارے سورج وغیرہ اجرام سماوی بھی گھومتے ہیں۔

شاگرد حیرت زدہ سوال کر رہے ہیں حضرت بات سمجھ میں نہیں آئی - جواب ملتا ہے، چرخ میخورد، گردانست - پھر سوال اٹھتا ہے - استاد چہ طور چرخ میخورد ؟ چہ طور گردانست ؟ ارشاد ہوتا ہے " آسیا مانند بچہ ہا آسیا مانند " رفتہ رفتہ یہ گرامی قدر .... ارشاد " آسیا ماں " اور پھر " آسماں " بن جاتا ہے - اور وہ دیکھئے ایک بہت بڑا دربار کھلے میدان میں لگا ہے - بڑے بڑے جودھا سیناپت، تلوار کے دھنی، کنور، کھتری راجپوت اپنے اپنے درجہ سے سنگھاسنوں پر براجمان ہیں - بیچ میں ایک چوکی پر سونے کی تھالی میں پان کا بیڑا رکھا ہے ایک صدا بلند ہوتی ہے " اس مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری کون لیتا ہے! " ایک راجپوت تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے اپنی جگہ سے اٹھتا ہے اور پان کا بیڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیتا ہے - جس پر پھول نچھاور ہوتے ہیں گلال پھینکا جاتا ہے - شادیانے بجتے ہیں - مجلس ختم ہوتی ہے آج ہم " بیڑا اٹھانا " ذمہ داری لینے کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں - او ہو! یہ کون صاحب ہیں منہ پر انسانی خون ملے ہاتھ میں ایک انسانی کھوپڑی لٹکائے کندھے پر پتھر کا کلہاڑا رکھے چلے آ رہے ہیں - ارے ان کے جسم پر تو لباس بھی نہیں کسی جانور کی کھال لپیٹ رکھی ہے، ان کے جسم سے کیسی بدبو آ رہی ہے، بہت برا کام کیا ہے، انہوں نے بڑے نالائق، نہیں نہیں یہ بھی احترام کے قابل ہیں اٹھ کھڑے ہو - ان کا احترام کرو یہ بزرگ ہمیں لفظ " سرخرو " دینے والے ہیں - ابتدا میں سرخرو ہونے کے لئے دشمن کا خون منہ پر ملا گیا، پھر گل معصفر اور گلال سے کام چلا اب صرف لفظ سے کام چلتا ہے -

دیکھا آپ نے الفاظ کے پردے میں کیسے کیسے ہنگامے اور داستانیں پنہاں ہیں۔ دورِ جدید کی لسانیات میں تسمیہ جات کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اسم انسانی ذہن کی وہ تخلیق ہے جو وعلم آدم الاسما کلھا سے معنون ہے۔

آیئے لفظ ہندوستان کا بھی تجزیہ کریں اور اسی لفظ سے اس کی کہانی سنیں۔ ہندوستان دو لفظوں، ہندو اور ستھان کا مرکب ہے۔ یعنی ایک اسم لفظ ہندو، دوسرے لفظ علامت ظرف مکان کی ترکیب سے ظرفیت کا مفہوم پیدا کرتا ہے جس کے معنی ہوں گے ہندوؤں کے رہنے یا بسنے کا مقام یا دوسرے لفظوں میں ہندوؤں کا وطن۔ یہ خالص فارسی زبان کا لفظ ہے۔ ہندو کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یونانی زبان کا لفظ ہو۔ لیکن ستان خالص فارسی نژاد لفظ ہے اور سنسکرت میں ستھان یا استھان بن جاتا ہے۔ یہ لفظ سنسکرت میں بھی ظرفیت کے معنی دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو لفظ راجستھان۔ ثابت ہوا کہ اس ملک کو ہندوستان کا تسمیہ مغربی آنے والوں نے دیا اور یہ بات بالکل صاف ہے کہ سکندر کے حملے سے لے کر، جو یقینی نہیں، مسلمانوں کی آمد کے آغاز اور اس کے بعد کا زمانہ جو یقینی ہے اس تسمیہ کا زمانہ ہو سکتا ہے اور یہی بات اس امر کی دلیل بھی کہ اس ملک کی زبان کو ہندی یا ہندوستانی کا نام دینے والے بھی یہی وارد ین ہو سکتے ہیں۔ ملک کی زبانیں سنسکرت، راجستھانی، قنوجی، اودھی، ہریانی، پنجابی وغیرہ وغیرہ۔ باہر سے آنے والوں کی زبان ترکی فارسی عربی، جو ملک کا نام ہندوستان قرار دیتے ہیں تو اس مخلوط زبان کا نام جو ان کی آمد کے بعد وجود میں آئی اسی

رعایت سے ہی موسوم ہونا چاہیئے۔ وہ چین کی زبان کو چینی، ترکستان کی زبان کو ترکی، تاتار کی زبان کو تاتاری فرنگستان کی زبان کو فرنگی کہتے تھے ملک کا نام، ہندوستان قرار دیکر ملک کی زبان کو ہندوستانی یا ہندی نہ کہتے تو اور کیا کہتے؟

مصنف "دکن میں اردو" کے بیان کے مطابق "تاریخ فرشتہ کا مصنف بھی اس زبان کو ہندی لکھتا ہے۔ اسی مصنف نے اس زبان کے تسمیہ سے متعلق مزید وضاحت ان الفاظ میں کی ہے" ہندی سے مراد وہ زبان ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی" مصنف "پنجاب میں اردو" کے بیان کے مطابق ہندی (زبان) برج، ہریانی، راجستھانی، سرائیکی، قنوجی، اودھی، وغیرہ زبانوں سے علحدہ ہے یعنی وہ زبان ہے جو مذکورہ بالا تمام زبانوں اور عربی، فارسی ترکی سے ملکر بنی۔ "دکن میں پہلے پہل یہ زبان ہندوستانی کہلائی" "اہلِ دہلی سنہ ۱۲۰۰ء کے آخر سے اس کو ریختہ کہنے لگے" (مولوی عبدالحق کے بیان) سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۰۰ء سے پہلے ہندی یا ہندوستانی کا لفظ کسی مصنف ادیب یا شاعر نے استعمال ہی نہیں کیا تھا بلکہ یہ صرف انگریزوں کی اپج تھی جو اس زبان کو ہندوستانی یا ہندوستانی کہنے لگے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۸۰۰ء سے پہلے لفظ اردو کی یہ حالات تھی جو مولوی صاحب ہندی، یا ہندوستانی کی ظاہر کرتے ہیں اور ملاحظہ ہو محمود شیرانی لکھتے ہیں " بابر کی آمد سے قبل ادبیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔" "یہ لغات نگار اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں" آگے چل کر اردو کے متعلق لکھتے ہیں" ہمیں یاد رکھنا چاہیئے

کہ یہ کوئی قدیم نام نہیں ہے نہ قدما اس کا ذکر کرتے ہیں نہ شعرا اس سے واقف ہیں نہ تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔

مولوی عبدالحق کے خطبات سے مندرجہ ذیل اقتباسات بھی میرے خیال کی تائید کرتے ہیں "حیدر بخش حیدری قصہ حاتم طائی کی زبان کو ریختہ کہتا ہے مہر چند کھتری لاہوری اپنی کتاب نو آئین ہندی (نو آئین ہندی کی ترکیب غور طلب ہے) میں لکھتا ہے اس نے قصہ" آذر شاہ اور سمن رخ کو فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا" "مصحفی اپنے دو تذکروں کو تذکرۂ ہندی گویاں کے نام سے یاد کرتا ہے" گولکنڈہ کا شاعر اور ادیب ملا وجہی اپنی کتاب "سب رس" میں جو ۱۰۴۵ھ کی تالیف ہے زبان ہندوستان کہتا ہے مولوی صاحب خطبات میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔" پرانی اردو میں 'نے' استعمال نہیں ہوتا۔ حیرت ہے کہ آپ کم و بیش بیس برس دکن میں رہے اور آپ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اہل دکن نئی اردو میں بھی نے نہیں بولتے کیوں بولیں جی کیا دلیل ہے آپ کے پاس ایسا بولنے کی"۔ کہا جا سکتا ہے کہ زبان کے 'مزاج' کے مطابق نہیں ہے اہل دکن کہیں گے عین زبان کے مزاج کے مطابق ہے بلکہ 'زبانوں' کے مزاج کے مطابق ہے ملاحظہ ہو۔ قلتم، گفتم، میں آکھیا، ذہ وِ لے دے، وغیرہ وغیرہ، وغیرہ وغیرہ میں نے کی قسم کا کوئی لفظ کہاں ہے! قواعد اردو صفحہ ۱۱۶ میں 'نے' کی بحث کے ضمن میں فرماتے ہیں "اردو افعال متعدی میں جو میں کے ساتھ نے استعمال ہوتا ہے وہ زائد ہے، چناں چہ مارواڑی، میواڑی، اور دیگر پرانی ہندی، اور دکنی میں بغیر نے،

کے استعمال ہوتا ہے، اور لیجیے پرانی اردو میں "نے" نہیں استعمال ہوتا اور پرانی ہندی میں "نے" نہیں استعمال ہوتا۔ کیا سمجھے! چناں چہ اس قسم کے جملات یا انداز بیان جس سے یہ ظاہر ہو یا ایسا اشتباہ پایا جائے کہ یہ زبان ۱۸۰۰ء سے قبل کے زمانہ میں اردو کہلاتی تھی، مثلاً "میر تقی اس زبان کو اردوئے معلے لکھتے ہیں"۔ جبکہ میر تقی کا مقصد اردوئے معلے اور رائج الوقت ریختہ کا فرق بتانا مقصود ہے، نیز ایسے جملات "پرانی اردو میں "نے" استعمال نہیں ہوتا تھا، مولوی عبدالحق، تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کے مرادف ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلمان اہل قلم اس کے ذکر کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ پھر مصنف "دکن میں اردو" کی اس عبارت پر غور کریں "ہندی سے مراد وہ زبان ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی"۔ مرقومہ بالا توضیحات ہی اس امر کی شاہد بھی کہی جا سکتی ہیں کہ ہندوستان کا تسمیہ ملک کے لیے اور ہندوستانی کا تسمیہ زبان کے لیے کل ملکی حیثیت کا حامل تھا۔

۲۔ زبان کے نام کے لیے لفظ اردو کی ابتدا میرزایانِ دہلی نے کی۔ منقولہ ماقبل فارسی تحریر کے اس پہلو پر میں ۱۹۳۰ء میں ترتیب دیے گئے مقالہ میں جو مواد فراہم کر سکا تھا وہ اگرچہ مدلل تھا، لیکن میرزایان دہلی کے نام نہ ہونے کی وجہ سے مستحکم ثبوت سے عاری تھا، علاوہ ازیں اس میں ایسی باتیں تھیں جن کا اعادہ نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ

آنچہ ما کردیم برخود ہیچ دردنیا نہ کرد

مصنف "پنجاب میں اردو" کے بیان کے مطابق "زبان کے معنوں میں لفظ

اردو کا استعمال چنداں قدیم نہیں ہے۔ اس کو رواج میں آئے ہوئے سوا سال کا عرصہ کم و بیش گذرتا ہے" ادبیات میں سب سے پیشتر میر محمد عطا حسین خاں تحسینؔ نے یہ نام اختیار کیا۔ چنانچہ نو طرز مرصع تالیف ۱۲۱۳ھ کا یہ فقرہ" اور جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبان اردوئے معلےٰ کا رکھے سو مطالعہ اس گلدستۂ نگارین کے سے ہوش اور نحوائے کلام حاصل کرے"۔ واضح ہو کہ ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء جان گل کرسٹ کا زمانہ ہے" میر امنؔ نے بھی تحسینؔ کی تقلید میں یہی نام رکھا۔ چنانچہ باغ و بہار ۱۲۱۷ء کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے،" (لیکن کون سے بزرگوں کے منہ سے !!) باغ و بہار صفحہ ۱۲ ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء جبکہ فورٹ ولیم کالج کو قائم ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔ اور جان گل کرسٹ کالج میں ہندوستانی کے پروفیسر تھے۔

رہا یہ امر کہ یہ کام چند نقرئی سکوں کے عیوض کیا گیا۔ قواعد زبان اردو مشہور بہ رسالہ گل کرسٹ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی مجلس ترقی ادب لاہور کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے واضح ہو جائے گا۔ صفحہ ۱۵ "میر امن نے باغ و بہار کے دیباچہ میں لکھا ہے" جب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ کے رسائی ہوئی"، کیا نیازمندی ہے ! اسی رسالہ کے صفحہ ۳۰ اور ۳۱ پر میر شیر علی افسوسؔ۔ کاظم علی جوانؔ، مظہر علی ولاؔ وغیرہم کے اسمائے گرامی بھی نیازمندان گل کرسٹ میں نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ چند سکہ

نقرہ یعنی کل دو سو روپے ماہوار پر جو صرف میر شیر علی اور میر بہادر علی کو ملتے تھے باقی کو اس سے کم، ہندوستان کے مسلمانوں کے سر پر "وخامت قیامت آثار" لانے کا یہ سودا کیا گیا۔ اس بخشش خاص کا اندازہ یوں کیجئے، کہ خود گل کرسٹ کو پندرہ سو روپے ماہوار ملتے تھے، اس کے ساتھ ہی کاشت وغیرہ کی مراعات بھی حاصل تھیں۔ رہا یہ امر کہ یہ تسمیہ وخامت قیامت آثار ثابت ہوا یا نہیں اس کا فیصلہ میں مسلمانوں پر چھوڑتا ہوں۔

جب انگریز اردو کا عفریت تیار کر چکے تو انہوں نے ہندی کا بھتنا اس کے بالمقابل کھڑا کر دیا۔ چناں چہ بقول مولوی عبدالحق "بنگال کے لفٹنٹ گورنر مسٹر جی کیمبل نے ۱۸۷۱ء میں اردو کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں اور اردو کو بنگال اور بہار سے نکال کر چھوڑا (واضح ہو کہ بنگال ہی اردو کا گہوارہ ہے جہاں فورٹ ولیم کالج میں اس کی پرورش ہوئی)" "۱۸۶۸ء اور ۱۸۶۹ء میں اردو اور ہندی کی بحث میں شدت ہو گئی"۔ "مارچ ۱۸۹۸ء میں سر انٹنی میکڈانل نے جب وہ گورنر ہوئے ہندی کی طرف داری کر کے اس آگ کو خوب بھڑکایا، ان صاحب نے اپنی کلکٹری کے زمانہ میں بہار میں بھی یہ کھیل خوب کھیلا تھا"۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ اردو کی موجودگی سے ہی جیفری اور میکڈانل کو ہندی کے پرچار کا موقع ملا ورنہ وہ اس معاملہ میں کسی اور لفظ کے تسمیہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے جبکہ خود بھی اس زبان کو ہندوستانی کہتے تھے، کیا تماشا ہے۔

انگریز اردو کے قدرداں، انگریز ہندی کے پرچارک!!!

موجود تحریریں جو اس موضوع پر پائی جاتی ہیں ایک زبردست مغالطہ یہ پیدا کرتی ہیں کہ جان گل کرسٹ اردو زبان کے بہت بڑے مربّی تھے مثلاً "میر امن دہلوی جان گل کرسٹ کو اردو کا قدر دان کہتا ہے" "جان گلکرسٹ نے اردو قواعد لکھی" وغیرہ وغیرہ۔ رسالہ گل کرسٹ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی میں گل کرسٹ کی تصانیف کی ایک فہرست دی گئی ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ جان گل کرسٹ کو ذاتی طور پر اردو سے کتنی دلچسپی تھی۔

1. DICTIONARY, ENGLISH, HINDOOSTANEE.
2. THE HINDOOSTANEE MANUAL OR CASKET OF INDIA.
3. THE HINDEE ROMAN ORTHOEPICAL ULTIMATUM.
4. THE HINDEE MORAL PRECEPTOR AND PERSIAN SCHOLAR'S SHORTEST ROAD TO THE HIDOOSTANEE LANGAUGE, OR VICE VERSA
5. THE EXERCISES FOR THE FIRST + SECOND EXAMINTIONS IN HINDOOSTANEE. AT ~~THE~~ COLLEGE OF FORT WILLIAM. CALCUTTA

6 PRACTICAL OUTLINS OR A
SKETCH OF HINDOOSTANEE
ORTHOAPHY IN ROMAN

7 HINDEE ARABIC MIRROR

8 THE HINDEE STORY TELLER

9 A GRAMMER OF HINDOOSTANEE
LANGUAGE.

اب چند اقتباسات اسی رسالہ سے نقل کرتا ہوں جو جان گل کرسٹ اور میجر جنرل انٹی بورٹ کمانڈر انچیف ایسٹ انڈیا کمپنی، گورنر جنرل با اجلاس کونسل کے مابین مراسلت سے متعلق ہیں۔ گل کرسٹ ایک جگہ لکھتا ہے۔ سودا کا دیوان مجھے مل گیا؛ ہندوستانی زبان میں اس وقت تک جو مہارت میں نے حاصل کی ہے، وغیرہ وغیرہ ...." وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل با اجلاس کونسل کو ایک عرضی لکھتے ہوئے جان گل کرسٹ لکھتا ہے "ہندوستان کے دوران قیام میں اپنا بیشتر وقت میں نے ہندوستانی زبان کی تحصیل میں صرف کیا ہے" گورنر جنرل کو ایک عرضی عدالتی رخصت کے سلسلے میں لکھی ہے۔ اس کا ایک جملہ نقل ہے" ہز لارڈ شپ کی عنایت سے ہندوستانی پروفیسر کے جس عہدے پر میں مامور ہوں اس سے باضابطہ

مستحق ہو جاؤں،، رسالہ گل کرسٹ صفحہ نمبر ۷ اگرچہ چند الفاظ کے وے ہندی ہیں بطور تانیث کے مستعمل ہیں جیسے دعا، دوا، سزا، قبا، فضا، بلا، غذا وغیرہ وغیرہ۔ دیکھا آپ نے جان کے نزدیک جس زبان میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ ہندی ہے مصدر کے ذکر میں جان لکھتا ہے (علامت مصدر کی ہندی میں حرف نا ہے) یہ ہیں اردو کے قدردان (بقول میر امن بحوالہ مولوی عبدالحق) جان گلگرسٹ ہو سکتا ہے کہیں کہیں بھول کر لفظ اردو لکھ بیٹھے ہوں جو تحقیق کے لیے سو دستاویز بن گیا۔

چند اقتباسات مولوی عبدالحق کی مقدمہ قواعد اردو سے نقل کرتا ہوں اس کے بعد آپ اندازہ لگائیں کہ یوروپین مصنفین نے اردو کے لفظ کو کتنی وقعت دی ہے اور جان گل کرسٹ اردو کے کیسے قدردان تھے"

مولوی صاحب نے مندرجہ ذیل کتابیں اس دعوی کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ انگریز نیز دوسرے یوروپین بھی اردو کے قدردان تھے "ہندوستانی فارسی اور عربی گریمر" مطبوعہ لندن ۱۸۸۲ء مولفہ یار صاحب، "زبان ہندوستانی کی گریمر" مسٹر ڈبلیو کیگرے ۸۳-۱۸۸۲ء "ہندوستانی زبان کی قواعد" پروفیسر فان کیو ۱۸۸۳ء، "ہندوستانی گریمر قیاسی و عملی" تالیف جرمن عالم اے۔سی۔ڈل مطبوعہ لپ زگ ۱۸۹۳ء "ہندوستانی زبان کے قواعد" مسٹر ایس ڈبلیو بری ٹن ۱۸۳۰ء مطبوعہ لندن "جدید خود آموز قواعد زبان

ہندوستانی مسٹر سٹیفورڈ ڈارناٹ مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء، ہندوستانی زبان کے قواعد، مولفہ ایس ارناٹ، ہندوستانی زبان کے قواعد از جرمنی عالم جے دت لو پراخنو مطبوعہ برلن ۱۸۵۳ء مطبوعہ لندن۔ ہندوستانی زبان کی ابتدائی کتاب، سر مونیرہ لیمس، جان گل کرسٹ کی کتاب "قواعد اردو" مطبوعہ ۱۸۰۹ء اور اسی کتاب کے متعلق رسالہ گل کرسٹ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی صفحہ ۳۲ پر لکھا ہے۔ "ہندوستانی زبان کے قواعد۔

مولوی صاحب نے اسی طرح ان تمام تصانیف کو اردو زبان کی قواعد ظاہر کیا ہے، ایک طرف تو اردو ہندی دو مختلف زبانیں ہیں دوسری طرف تمام وہ کتابیں جن پر جلی قلم سے ہندوستانی زبان کے قواعد لکھا ہے سب اردو کی قواعد ہیں۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے؟

مولوی صاحب کی ایک اور تحقیق ملاحظہ ہو جو خطبات ۷۵، ۴ پر ان الفاظ میں نظر آتی ہے "زبان کے معنوں میں ہندوستانی کا لفظ ہمارے کسی مستند، شاعر یا ادیب یا اہل زبان نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ یورپ والوں کی اپج ہے۔ یورپ کے سیاحوں نے جو سترہویں صدی سے اس ملک میں آنا شروع ہوئے اس زبان کو ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا لیکن اس لفظ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں اس وقت فروغ ہوا جب ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج

قائم ہوا۔"

زبان کے معنوں میں ہندوستانی کا لفظ ہمارے کسی مستند شاعر یا ادیب یا اہل زبان نے کبھی استعمال نہیں کیا یہ الفاظ مولوی عبدالحق کے ہیں اور" گولکنڈہ کا شاعر اور ادیب ملا وجہی اپنی کتاب سب رس میں جو ۱۰۵۴ء کی تصنیف ہے اس زبان کو ہندوستانی زبان لکھتا ہے" یہ الفاظ بھی مولوی عبدالحق کے ہیں اور ان کی تائید دوسرے مصنفین بھی کرتے ہیں۔ دوسرا جملہ" یہ یورپ والوں کی اپج ہے۔ یورپ کے سیاحوں نے جو سترہویں صدی سے اس ملک میں آنا شروع ہوئے اس زبان کو جو شمالی ہند میں بولی جاتی تھی اندوستان یا اندوستانی اور بعدازاں ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا۔" اس جملہ کے مطالب کا تعلق ملک ہندوستان اور ہندوستانی زبان کے تسمیہ سے ہے جو میں لفظ ہندوستان کے تجزیہ کے تحت پہلے بیان کر چکا ہوں، یہاں صرف لفظ اندستان یا اندوستانی کی وضاحت مطلوب ہے۔ اس لئے اور بھی کہ دریائے سندھ کا انگریزی نام انڈس اسی ضمن کی چیز ہے۔ اس کی وضاحت خود لفظ اندستان کی وضاحت کے مرادف سمجھنی چاہیئے۔ انسائیکلوپیڈیا (برٹینکا) کی رو سے سند یا سنتھوس لاطینی اور یونانی الفاظ ہیں۔ دریائے سندھ کا ایک قدیم نام اباسین یا اباسندھ بھی میری نظر سے گزرا ہے بلکہ اباسین تو اس وقت بھی اگرر کے بالائی علاقہ میں اس دریا کے لئے بولا جاتا ہے۔ اگر آبا کے معنی باپ کے لئے جائیں تو برہمپتر کے

معنوں کے لحاظ سے اباسین یا اباسینده کے معنی صاف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دریا کے قریب کا علاقہ سین، سندس، سنقوس، سیندھ یا سندھ کہلائے تیز باشندے بھی بتدریج اسی طرح اور آخرکار سندھو کہلائے تو بالکل بجا ہے۔ اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ "س" کا "ہ" سے تبادلہ کس بنا پر ہوا اس لئے کہ باوجود تلاش کے جس کی حتی المقدور کوشش کی گئی لیکن یہ عقدہ حل نہیں ہو سکا۔ بہرحال "س" کا "ہ" سے تبادلہ ہوا اور سندھو ہندو کہلائے۔ ہندوستان کے اضافہ سے ہندوستان بنا۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ہندو اسم اور ستاں ظرف مکانی کا مرکب ہندوستان ہے۔ فارسی میں ہندو بمعنی ورذیا رہزن استعمال ہوا ہے علاوہ ازیں اس کا شاہد کوہ ہندوکش بھی ہے۔ یعنی وہ پہاڑ جس کے قریب رہزن مارے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایران کے تارکین وطن آریہ جو آب و دانہ کی تنگی یا کسی اور وجہ سے وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے، کوہ ہندوکش کے مشرقی علاقہ سے دریائے سندھ اور دوآبہ گنگ و جمن تک پھیل گئے جب ان کے قدم جم گئے تو کوہ ہندوکش کی سرحد پار کر کے وطنی بھائیوں پر موقع بموقع ڈاکہ ڈالنے لگے جواباً ادھر سے بھی ان کی سرکوبی کا انتظام کر دیا گیا اور اس پہاڑ کو جہاں یہ جھڑپ ہوتی تھی کوہ ہندوکش کا نام دیدیا، اور اسی نام کی بنا پر ملک کا نام ہندوستان قرار دیا گیا۔

مقدمہ قواعد اردو میں ایک کتاب پرتگیز گرمیٹکا: ان دوستان اور رسالہ گل کرسٹ خلیل الرحمن میں گرمیٹکا اندوستینیکا (ان دونوں لفظوں میں ٹ کا تلفظ نہیں ہونا چاہیئے) بھی آئے ہیں ان دونوں لفظوں نے ذہن میں دبا ہوا ایک اور خیال ابھار دیا۔ چند دن ہوئے کراچی میں پرتگیزی مقبوضات کے ایک عرب مور سے ملاقات ہوئی باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ پرتگیزی مسلمان "ممتن" کہلاتے ہیں۔ میرا ذہن فوراً لفظ محمڈن کی طرف منتقل ہو گیا۔ پرتگیز ڈ، ٹ، ح کا تلفظ ادا نہیں کر سکتے اغلب ہے کہ اسی طرح اندوستان اور اندوستینیکا کا تلفظ پہلے پرتگیزوں نے لفظ ہندوستان سے نکالا ہو، اس کے بعد اسی رعایت سے دریائے سندھ کا تلفظ اندس کیا ہو، جو انگریزوں نے انڈس کر دیا، جبکہ انگریزوں سے پہلے ہندوستان میں پرتگیزی اثرات کا پایا جانا تاریخ سے ثابت ہے۔

ممکن ہے کہ میرے یہ قیاس صحیح نہ ہوں بہرحال یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لفظ اندوستان ہندوستان کا پرتگیزی تلفظ ہے جو انگریزوں نے پرتگیزوں سے لیا انگریزوں نے اس ملک پر یہ لفظ یا اس کی رعایت سے یہاں کی زبان کے لئے ہندوستانی کا لفظ مسلط نہیں کیا۔ تمیر ہملہ" لیکن اس لفظ "ہندوستانی" کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں اس وقت فروغ ہوا جب ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا، صنعت تضاد کی لاجواب مثال ہے یعنی مولوی

صاحب کے بیان کے مطابق انگریزوں کی قدردانی نے ۱۸۰۰ء میں اردو کو تقویت پہنچانی شروع کی اور ان ہی کے بیان کے مطابق انگریزوں کی سترہویں صدی کی اپیچ نے اسی سال ہندوستانی زبان کو فروغ دیا۔ فاعتبروا یا اولی الالباب

رسالہ گل کرسٹ کے مطالعہ سے ایک اور بڑی دلچسپ بات معلوم ہوئی مولف نے جان گل کرسٹ کے مندرجہ ذیل الفاظ ایک مقام پر نقل کیے ہیں "چنانچہ اس زبان کو جسے اس زمانہ میں "مورس" کہتے تھے سیکھنے کے لیے میں جم کر بیٹھ گیا" جان گل کرسٹ کے قول کے مطابق یہ زبان سترہویں صدی یا کچھ آگے پیچھے مورس کہلاتی تھی۔ گل کرسٹ کی یہ معلومات پرتگیزی اثرات اور انگریزوں کے ان سے میل جول کا نتیجہ تھا۔ اس لئے کہ یورپ کے اس علاقے میں مور عربوں کے عروج کے زمانہ میں عام مسلمان مور کہلاتے تھے پرتگیزیوں نے ہندوستان میں بھی انہیں یا ان کی زبان کو مورس کہنا شروع کر دیا ہوگا۔

مسلمانوں کی آمد سے جو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی اس کے نمونے کے بغیر یہ مقالہ تشنہ رہ جائے گا۔ چنانچہ "پنجاب میں اردو" سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتا ہوں "دکنی نثر کا ابتدائی نمونہ از معراج العاشقین مصنفہ حضرت گیسودراز" نبی کہے تحقیق خدا کے درمیان تے ستر ہزار پردے اجیالے کے ہور اندھیارے کے۔ اگر اس میں سے ایک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں"۔ دکنی نثر ۱۰۴۵ھ ملا وجہی از ڈاکٹر

محی الدین زور نمبر" صحبت اس کی بھاوے بات اس کی جوں شکر جوں بنات
جو لکن دنیا تو لکن اسے حیات بارے جس وقت تھا یک ہزار چہل و پنج
اس وقت ظہور پکڑیا یہ گنج - جو کوئی صاحب سخن اچھیکا جو کوئی صاحب
فن اچھیکا اسے یو سخن اثر کرے گا مسرت بخیر کرے گا"

افسوس کہ کسی ہندو ادیب کا قدیم نمونہ تحریر میسر نہیں اس لئے
کبیرداس کے چند اشعار اردو نے نقل کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ کبیرداس ہندوؤں
کے نزدیک ہندو اور مسلمانوں کے نزدیک مسلمان تھے اس لئے ان کا کلام
دونوں طرف سے پیش کیا جا سکتا ہے چناں چہ میں نے بھی انتخاب میں اس
بات کا خیال رکھا ہے ان کا زمانہ سکندر لودھی کا زمانہ ہے۔ یہ چند اشعار
ایک بحر کے ہیں اور ہیئت کے اعتبار سے غزل کے من میں آسکتے ہیں:

ہمن ہیں عشق دیوانہ ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزادیاں جگ میں ہمیں دنیا سے یاری کیا
جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے دربدر پھرتے
ہمارا یار ہے ہم میں ہمن کو بے قراری کیا
خلق سب نام کو اپنے بہت کہ سر پٹکتا ہے
ہمن گورو نام ساچا ہے ہمن دنیا سے یاری کیا
نہ پل بچھڑے پیارا ہم سے نہ بچھڑیں ہم پیارے سے

انہیں سے نیہہ لاگی ہے ہمن کو بیقراری کیا

کبیرا عشق کا ماتا دوئی کو دور کر دل سے

جو چلنا راہ نازک ہے ہمن سر بوجھ بھاری کیا

یہ نمونہ عربی فارسی آمیزش کی زیادتی کا ہے مقامی بولی غالب برج یا ہریانی ہے۔ اس بھجن کے پانچویں مصرعہ سے دکنی زبان کے رچاؤ کا سماں بندھ گیا ہے حرف کو کے بعد نون غنہ لگائیے اور مصرعہ یوں پڑھیے۔ خلق سب نام کوں اپنے بہت کر سر ٹیکتا ہے۔ اس کے علاوہ جگ، ہمن، بچھڑے، عشق مستانہ سے دکنی زبان کی مماثلت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ زبان جو سکندر لودھی کے زمانہ میں دکن اور شمالی ہند کے ڈانڈے ملاتی تھی۔

چند دوہے مقامی زبان کے رجحان پر بھی ملاحظہ کریں ،

داد و دعوئی چھوڑ دے نردعوی دن کاٹ

کتنے سوداگر گئے ایس پہاری[1] ہاٹ

اس میں نردعوئی قابل غور ہے جس کی سلاست، اس نئی زبان میں دوسری زبانوں کی آمیزش سے ہر طرح کے مرکبات بنانے کی سہولت

---

[1] ایک نسخہ میں بہاری بھی دیکھا ہے۔

اور جاذبیت کا پتہ دیتی ہے۔

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے

دو پاٹن کے مربیچ میں آثابت بچانہ کوئے

کبیرا مرمربیچ رہا کوئی نہ پوچھے سار

وہ تو ہری کا داس ہے موت رہی جھک مار

یہ زبان ملّا وجہی ۱۰۴۵ھ سے تقریباً چار سو برس بعد کی ہے اور اسی لحاظ سے تشکیل میں زیادہ سڈول ہے جس کی بنا پر مصنّف " دکن میں اردو " سے حقیقت کی تراوش ان الفاظ میں ہوئی " ہندی سے مراد وہ زبان ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی " اور مصنّف " پنجاب میں اردو " نے اسے ان الفاظ سے جامہ زیب کیا " ہندی، برج، ہریانی، راجستھانی، سرائیکی، قنوجی، اودھی وغیرہ زبانوں سے علیحدہ زبان ہے " ایک مرتبہ پھر مرقومہ ماقبل فارسی تحریر کے اس جملے پر غور کریں " باید کہ شوری برائے تسمیۂ زبان لفظ ہندوستانی را ترجیح دادہ باشند " یہ تھے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے وہ مجاہد جن کے سیاسی تدبر کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔

ان شواہد کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اردو اور ہندی دو زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک زبان کا قدیم اور تاریخی یا نظری

نام ہندی اور عاید کردہ غیر تاریخی یا غیر فطری نام اردو ہے - اردو کا تسمیہ اردوئے شاہی سے منسوب کریں یا اردوئے معلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا، زبان کے نام کا بنیادی اصول قوم اور ملک کے نام سے مناسبت ہے - بلاشبہ لفظ اردو گذشتہ سوا سو برس کے آغاز میں زبانوں پر آگیا تھا لیکن جان گل کرسٹ کے عہد تک مسلمانوں میں اس لفظ کا استعمال بالکل نہیں پایا جاتا - ثقہ لوگ اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے لیکن اس کے برعکس زبان کے لئے ہندی یا ہندوستانی کا لفظ استعمال کرنے میں انہیں کوئی کراہیت محسوس نہیں ہوتی تھی -

ملاحظہ ہو مقدمہ قواعد اردو مولوی عبدالحق ؒ اردو کے معنی لشکر کے ہیں اور لشکری زبان جیسی ہوتی ہے ظاہر ہے یعنی آدھا تیتر آدھا بٹیر اس لئے اول اول ثقہ لوگ اس کے استعمال سے بچتے رہے اور اس کے لکھنے پڑھنے کو عار سمجھتے رہے لیکن رفتہ رفتہ اس کے قدم جمتے گئے اور مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں شعرا نے اس بچے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور پال پوس کر بڑا کیا - ہندی یا ہندوستانی سے کراہیت انگریز نے پیدا کی اور بعض میرزایان دہلی کے ذریعہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت کو وہاں پہنچا دیا جہاں سے لوٹنا ان کے لئے ناممکن ہوگیا خود انگریز نے اس لفظ کے عام کرنے میں جزوی حصہ لیا خاص طور پر ایسے

مواقع پر صاف پہلو بچا گیا جہاں اس کا علمی وقار مجروح ہو سکتا تھا۔ چنانچہ گل کرسٹ یا کسی دوسرے یورپین مصنّف نے اپنی کسی تصنیف کے سرِ ورق پر لفظ اردو نہیں لکھا۔ گارسین دتاسی اور گل کرسٹ کا اس لفظ کو ہندوستانی زبان کے لیے استعمال کرنا اس زمانہ کے واحد منظوم ادب کی تحقیق اور زبان کے قواعد وغیرہ لکھنا، اس ملک یا اہل ملک یا زبان کے مفاد کی بات نہیں تھی بلکہ یہ خود ان کے اپنے مفاد کی بات تھی جسے ان کا تحقیقی یا علمی شغف نہیں بلکہ سیاسی شغف کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔

مختصر یہ کہ انگریز نے بڑی چابک دستی سے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اردو کا نعرہ مسلمانوں کے لیئے لازمی ہو گیا اور انگریز کی سیاست کام کر گئی جان گل کرسٹ اپنی جان تو بچا گئے اور اردو کی بندوق، بے چارے انجان میرزایان دہلی کے کندھے پر رکھ کر داغ دی مسلمان اس زمانہ میں انگریز کے مورد عتاب تھے، چنانچہ ان میں جو سرکار کے دربار میں حضوری کے جویا تھے اس نشانے کا ہدف بن گئے۔

یہ تمام ہنگامہ شروع سے آخر تک سیاسی تھا خود مولوی عبدالحق کا طرزِ عمل اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ اردو کی علمبرداری میں ان کا ذہن صاف نہیں تھا چنانچہ راجندر پرشاد اور عبدالحق

معاہدہ" اور بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۶ء
میں گاندھی کے ہندی پر اصرار کے جواب میں مولوی صاحب کے
یہ الفاظ" جب آپ ہندی کو نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کو کیسے چھوڑ
سکتے ہیں" (اس جملے کا عکس یہ ہے کہ اگر آپ ہندی کو چھوڑ دیں
تو ہم اردو کو چھوڑ دیں گے یعنی بات ہندوستانی پر طے ہو جائیگی
چناں چہ نیشنل کانگریس بھی ہندوستانی کے حق میں فیصلہ دے چکی
تھی)، نیز اردو کانفرنس میں مولوی صاحب کا ان الفاظ میں اظہار
خیال (مسلمانوں) "نے ایک زبان اور ایک تہذیب کی بنیاد رکھی
وہی تہذیب دراصل ہندوستانی تہذیب ہے وہی زبان دراصل ہندوستانی زبان ہے کیونکہ اس میں
ہندو اور مسلمان دونوں کا رنگ روپ موجود ہے" میرے دعویٰ پر دلیل
ہے مولوی صاحب مقدمہ قواعد اردو میں فرماتے ہیں:" انگریزوں
کے آنے سے ملک کو اگر کچھ فوائد پہنچے ہیں تو ان میں بلاشبہ ایک
یہ بھی ہے کہ انہیں نے ایک ایسی زبان کی سرپرستی اور تقویت میں
ہاتھ بٹایا جو ملک کی مختلف اقوام کی متحدہ اور مشترکہ زبان تھی اگرچہ
اس میں ان کی ذاتی غرض پنہاں تھی کیونکہ بغیر ایک زبان سیکھے ان
کو اپنی اغراض میں کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر ذاتی غرض ہی کے ساتھ
ملکی اغراض خود بخود انجام پا گئے"۔ اسی مقدمہ قواعدِ اردو میں مولوی

صاحب لکھتے ہیں۔ میں اس موقع پر اردو ہندی کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا کیونکہ یہ بحث میرے خیال میں بے سود ہے دسر پیٹنے کو جی چاہتا ہے؟ اول تو اس لئے کہ صرف و نحو میں اس بحث کا کوئی موقع نہیں۔ خصوصاً اس خیال سے کہ اس امر میں تقریباً دونوں ایک ہیں (یعنی ہندی اور اردو کی صرف و نحو تقریباً ایک ہے)، اور جزوی اختلاف کوئی زیادہ فرق نہیں (اس زیادہ فرق نہیں نے کتنے دریائے خون بہائے ہیں!!) دوسرے جو شخص اس ملک کی مختلف زبانوں کی تاریخ غور سے دیکھے گا معلوم ہو جائے گا کہ فریقین نے محض سخن پروری اور ہٹ دھرمی سے کام لیا ہے، جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ڈیڑھ سو برس سے زائد اردو گردی کی اس ہڑ بونگ میں ایک کارنامہ بھی انجام پایا ہے اور وہ کالج کا قیام ہے جو درحقیقت اردو ہندی قضیہ کا واحد ثمر شیریں ترین ہے۔ جس کی بنیاد مولوی عبدالحق ہی کے ہاتھوں ہوئی، جو بلاشبہ قوم اور ملک پر ایک احسان عظیم ہے اب اس کالج کا نام

"جامعہ عبدالحق"

ہونا چاہیئے۔

اگر ہندی کے مقابلے میں اردو کا شاخسانہ کھڑا نہ کیا جاتا اور ہندوستان کی زبان کے لیے ہندی کا تسمیہ ہی قبول کر لیا جاتا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ اگر ایک طرف ہندو، زبان میں سنسکرت کے نامانوس الفاظ شامل کرنے کی کوشش کرتے تو دوسری طرف مسلمان عربی اور فارسی کے الفاظ و تراکیب لانے کی جدوجہد کرتے لیکن رائج وہی الفاظ ہوتے جو زمانہ کا ساتھ دے سکتے۔ تاہم اس کھینچا تانی میں عوام کی زبان کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتی، ہندو ادبا اور معقول ہندو یقینی طور پر فارسی آمیزش کے طرفدار ہوتے غالبؔ اور اقبال کی زبان کا معیار عام ہو جاتا۔ اس لیے کہ جتنی شیرینی فارسی عربی الفاظ اور تراکیب سے زبان میں پیدا ہوتی سنسکرت کی آمیزش سے اتنا ہی بھونڈا پن پیدا ہوتا اور جس ادب کا لطف ہندو ادبا اٹھا چکے تھے، بمصداق

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

غالبؔ و اقبال کی زبان کی طرف کھنچے پٹیل بانی کی طرف رخ کرنا ان کے لیے سوہان روح ثابت ہوتا، آج بھی ہندوستان میں اس زبان کے شیدائی ہندو ادیب اور شاعر اپنے رشحات قلم سے اس زبان کی آبیاری کر رہے ہیں، بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر

ہوگا کہ اسی زبان کے " آب حیات " سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں، اسی گیسوئے منت پذیر شانہ کے اسیر ہیں۔ نہرو نے سیاست کے میدان میں کیا کچھ نہیں کیا لیکن زبان کے معاملے میں پٹیل بانی سے اظہارِ نفرت کئے بغیر نہ رہ سکا۔ آخر کار زبان کے معاملہ میں فتح فارسی عربی آمیز زبان کی ہوتی۔

گذشت آنچہ گذشت

غرض یہ کہ رفتہ رفتہ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ہمیں پاکستان کا مطالبہ کرنا پڑا اور اب جبکہ پاکستان کا قیام عمل میں آچکا ہے اور اس کی بین الاسلامی حیثیت بھی تسلیم کر لی گئی ہے ہمیں دنیا کے سامنے ایسا نمونہ پیش کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے جو مضحکہ خیز ہو۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو گا جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے نہ ہوں، جہاں مختلف علاقائی وحدتیں نہ ہوں، لیکن قومی زبان سب کی وہی ہو گی جس کا نام ملک کے نام پر ہوگا ۔۔۔۔۔ چونکہ نیا وجود میں آیا ہے اور یہ کہ اس کے قیام کے وقت ہم زبان کے لئے لفظ اردو کو ہی ترجیح دے سکتے تھے اس لئے مقتضائے وقت کے لحاظ سے اس لفظ کو قومی زبان کا تسمیہ قرار دینے کی تاویل ہو سکتی ہے۔ لیکن اب تو پاکستان کو قائم ہوئے

ستره سال گذر چکے ہیں۔ ہمیں دنیا کے مسلمہ اصول کے مطابق ملک قوم اور زبان کے ناموں میں مناسبت پیدا کرنی چاہیئے اور ملک میں سب سے زیادہ سمجھی اور بولی جانے والی زبان کا نام پاکستان ملک اور پاکستانی قوم کی مناسبت سے "پاکستانی" اختیار کر لینا چاہیئے۔

مجھے خوف ہے کہ کہیں برادران وطن بنگالی اور اردو یا اسی قسم کا کوئی اور "شاخسانہ" نہ کھڑا کر دیں بالکل سیدھی بات یہ کہ کثیر الافراد زبان کا سوال نہیں، بلکہ کثیر الفہم زبان کا سوال ہے۔

ہمارے ملک میں زبان کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوئے ان میں اردو اور بنگالی کا مسئلہ ایسا ہے جو اپنی نوعیت اور انجام کے اعتبار سے انتہائی غور طلب اور انتہائی سنگین ہے اگر اُس وقت اِس زبان کا نسمیہ پاکستانی ہوتا تو یہ جھگڑا پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے امکانات اسی لفظ اردو میں پوشیدہ تھے، معاملہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ گولی چلانے کی نوبت آگئی جس کے نتیجے میں تین طلبا ہلاک ہوئے پاکستان کی دو زبانیں قرار دی گئیں اور پاکستان کے ماتھے پر ہمیشہ کے لئے کلنک کا ٹیکا لگ گیا وقتی طور پر ایسے واقعات کی تاویل کر کے سرخروئی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرتی ہمیں ایسے شرمناک واقعات کے رونما ہونے کا آئندہ کے لئے حتمی سدِ باب

کرنا چاہیئے۔ زبان کا تسمیہ پاکستان ملک اور پاکستانی قوم پر نہ ہونے سے لاشعوری طور پر پاکستانی قومیت اور وطنیت کی نفی ہوگی جو قومی اتحاد اور یک جہتی کے لئے سم قاتل ہے۔

ایک دوسرا المیہ جو اردو بنگالی کے المیہ سے کسی طرح کم نہیں انگریزی زبان کا تسلط ہے، جسے برقرار رکھنے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراشے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے کچھ ایسے برادران وطن بھی ہیں جنہیں صرف کرسی چاہیئے اور چونکہ کرسی پر انگریزی کا تسلط تھا، خود زبان کے معاملے میں آدھا تیتر آدھا بیٹر کے مصداق تھے، قومی زبان سیکھنے پڑھنے بولنے کے لئے ایک طویل عرصہ درکار تھا، اور یہ کرسی پسند کرسی سے چمٹے رہنا چاہتے تھے، پھر یہ کہ قومی زبان میں آپ کی قابلیت کے جوہر کھلتے تھے اور نام نہاد انگریزی دانی میں کسی حد تک ان کی قابلیت پر پردہ پڑتا تھا، اس لئے یہ ڈھونگ رچایا گیا کہ قومی زبان سرے سے اس قابل ہی نہیں کہ ملکی مسائل اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کارآمد ہو سکے۔ لہٰذا انگریزی برقرار رہے یا پھر اتنے اور اتنے عرصہ انگریزی کا رہنا لازمی ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ قومی زبان میں جو صلاحیت ہے پوشیدہ نہیں، ضرورت کے لئے دنیا کی کسی زبان کا لفظ اس زبان میں شامل کریں، وہ پاکستانی کا لفظ ہوگا اور اس کے

استعمال سے زبان کی تشکیل پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ماخوذ از انشا اللہ خاں انشا بالفاظ دیگر۔

جدید علوم کے انگریزی سے پاکستانی میں ترجمے کیے جایئں، یہ ایک مصدقہ امر ہے کہ اصطلاحات سے قطع نظر متن کا ترجمہ کرنے میں کوئی دقت نہیں۔ رہا انگریزی اصطلاحات کا مسئلہ تو ان کا ممکن ترجمہ کر دیا جائے نہ ہو سکے تو اصطلاحات جوں کی توں رہنے دی جائیں ترجمہ شدہ اصطلاح کے ساتھ قوسین میں انگریزی لفظ دے دیا جائے۔ آخر انگریزی آمیز زبان بولی ہی جاتی ہے جس میں انگریزی کی غیر ضروری آمیزش ہوتی ہے، تو چند الفاظ ضرورت کے لحاظ سے اضافہ کر دینے میں کیا قباحت ہو گی۔ انگریزی اور دوسری عالمی زبانوں کے الفاظ پاکستانی میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً ٹوسٹ، کمرہ، بنگلہ ریسٹورنٹ یا ریستوران بسکٹ ٹکٹ وغیرہ وغیرہ جن میں ایسے لفظ بھی ہیں جن کا پاکستانی بدل پیدا کرنے کی اب ضرورت ہی نہیں رہی جیسے بسکٹ ٹکٹ کمرہ بنگلہ وغیرہ، چند الفاظ اور بھی ایسا کرنے سے تو زبان کا دامن اور وسیع ہو گا جس لفظ کا ترجمہ نہ ہو سکے یا اچھا ترجمہ نہ ہو سکے اس کو اسی شکل میں اپنایا جا سکتا ہے۔ یوں بھی نت نئی ایجادات انگریزی کے نئے الفاظ کی آمیزش کی مقتضی ہیں البتہ بنیادی امر یہ ہے کہ فعل کے استعمال

کا خیال رکھا جائے جو زبان کی تشکیل میں خاص اہمیت کی چیز ہے چنانچہ "ہم بولتا ہے" نہ بولا جائے ایسے کلام بلاغت نظام سے زبان کی شکل مسخ ہو جائے گی اور بولنا ہی پڑے گا ؂

تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

مختصر یہ کہ انگریزی کے پرستاروں کا یہ کہنا کہ قومی زبان میں صلاحیت نہیں اور اسے اس کا مقام دینے کے لئے "مدتیں" مقرر کرنا محض حیلہ سازی ہے انگریزوں سے آزادی حاصل کئے سترہ برس ہو گئے لیکن ہم ہیں کہ ان سے کچھ ایسے مرعوب ہوئے ہیں کہ اپنا عزیز ترین اثاثہ ان کے ہاتھوں لٹوا کر بھی ان کی غلامی پر فخر کرتے ہیں۔ ہمارے عالمگیر زوال میں خود ہماری کوتاہی تو ایک کھلا سبب ہے لیکن اس میں انگریز نے جو کردار ادا کیا ہے، اسے جمال الدین افغانی جیسے بزرگوں کے دل سے پوچھئے۔ میں نے ایسے تمام مواد کو اس مقالہ سے خارج کر دیا ہے۔ پھر بھی یہ چند الفاظ نکل ہی گئے، جو میرے ذہنی کرب کا مظہر اور ہمارے معاملہ میں انگریزوں کے رویہ کی پوری تاریخ کا آئینہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان کو نظر انداز کر دیا گیا تو یورپ سے اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کیونکر ہو گی، تو عرض یہ کہ مدعا بھی یہ نہیں ہے،

ؔ علاقائی زبان بولنے والوں کو ایسی رعایات دی جا سکتی ہیں لیکن انگریزی کو ترجیح دینے والوں کو نہیں۔ لاحظہ کہ یہ حضرات ارادتاً زبان کو بگاڑتے ہیں۔

اختیاری مشکل انگریزی نصاب کے ذریعہ یہ دقت دور کی جا سکتی ہے جبکہ ثانوی درجہ تک، لازمی آسان انگریزی نصاب، خود زبان کا لازمی جزو ہے۔ ساتھ ہی جہاں تک ممکن ہو سکے نہیں، بلکہ ممکن بنایا جائے، کہ ملک میں ایسی سہولتوں کا انتظام کامل تیز رفتاری اور دیانت داری سے شروع ہو اور جلد اختتام پذیر ہو، تاکہ یورپ جانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

اب میں ایک اور قباحت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اہلِ ملک میں باہم منافرت پھیلانے کا باعث بنی ہوئی ہے اور وہ ہے دہلی اور لکھنؤ کے لب و لہجہ روزمرہ اور محاورہ پر فخر کرنا، اور دوسروں کی بول چال پر ناک بھوں چڑھانا فقرے چست کرنا، پھبتیاں کسنا جو انتہائی ناپسندیدہ باتیں ہیں جن کے مورد ممکن ہے کسی وجہ کے باعث جواب دینا مناسب نہ خیال کریں لیکن دل میں ضرور برا مانیں گے۔ ملک کے تمام علاقوں میں ارباب علم و فضل موجود ہیں، صرف روزمرہ محاورہ اور لب و لہجہ کے اختلاف پر انہیں غیر اہل زبان قرار دینا اور ان کا احترام نہ کرنا دل شکنی نہیں تو اور کیا ہے، پھر کسی کا دل دکھا کر موانست کے راستے کیونکر کھل سکتے ہیں!

بعض حضرات اس امر کے مدعی ہیں کہ درست زبان صرف انہی کا حصہ

ہے جو اہل زبان کہلاتے ہیں، یہ حضرات آج بھی ٹکسالی زبان کی رٹ لگائے جا رہے ہیں جبکہ وہ ٹکسال ہم ہندوستان میں چھوڑ آئے جہاں ان کے زعم میں زبان کا سکہ ڈھلتا تھا وہ بھی آج سے پچاس ساٹھ سال قبل۔ لیکن یہ ہیں کہ آج بھی اسی روزمرہ اور اسی محاورہ کو زبان کا معیار قرار دیتے ہیں، جبکہ وہ روزمرہ اور محاورے آج کل ثانوی مدارس کی کتابوں میں ایک فہرست کا اضافہ تو کرتے ہیں لیکن محرومیٔ افادیت کے نقش فریادی سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

حقیقت یہ ہے کہ روزمرہ اور محاورہ کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں، زمانہ اپنا روزمرہ اپنے ساتھ لاتا ہے اور اپنے ساتھ لے جاتا ہے، روزمرہ صرف ان "روزوں" کو متاثر کرتا ہے جن میں اس کی تخلیق ہوتی ہے وہ روز گئے اور وہ روزمرہ بھی ان کے ساتھ عدم کو سدھارا۔ پھر نئے روز آتے ہیں، اپنے ساتھ نئے حالات لاتے ہیں، نیا روزمرہ بھی آن دھمکتا ہے۔ اور یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے،

یہی حالت محاورہ کی ہے محاورۃ لغت میں بات چیت کرنے کو کہتے ہیں پھر اس دعویٰ پر کیا دلیل ہے 'ہاتھ دینا' تو محاورات

یعنی بات چیت ہے اور تھپڑ مارنا، مکہ مارنا، بات چیت نہیں۔ واقع یہ ہے اس قسم کے تصورات انتہائی غیر جمہوری اور شاہ پرستی کے زمانہ کی یادگار ہیں، چناں چہ جس شہر میں بادشاہ رہتا تھا وہ دوسرے شہروں کے مقابلہ میں ذی مرتبت تصور کیا جاتا تھا۔ وہی شہر ملک کا دارالسلطنت ہوتا تھا، اس لئے وہاں تمام "ذی مرتبت" افراد کا اجتماع ہوتا تھا۔ یہ اجتماع شاہی دربار کے رکھ رکھاؤ اور آداب کا خوگر ہر موقع و محل پر اس کی نقالی میں مصروف رہتا تھا، زبان اس کے اثرات سے کیسے بچ سکتی تھی، لہٰذا تصنع اور بیجا تکلف کی نمود میں فارغ البال مرد وزن کی محاورت زبان کا طرۂ امتیاز بن گئی۔ یہ ہے اس روزمرہ اور محاورہ کی اصلیت جس پر اہل زبان ہونے کا انحصار ہے۔ یہ باتیں ایک مخصوص دور کی تھیں جو گذر گیا، دنیا کا ہر دارالسلطنت اس صورت حال سے گذرا ہے لیکن دنیا جہاں آج ہے وہاں ان باتوں کی کوئی قیمت نہیں،

مجھے ایسے حضرات کی سادگی پر حیرت ہوتی ہے جو اردو کو پاکستان کی مادری زبان کے طور پر پیش کرکے یہ چاہتے ہیں کہ یہ زبان ملک کے گوشے گوشے میں تسلیم کرلی جائے۔ انہیں یہ نہیں معلوم کہ

ملک کے دور دراز اندرونی علاقوں میں آج بھی یہ زبان 'ہند' کو یا 'ہندوستانی' کے نام سے موسوم ہے اور اس کے بولنے والے ہندوستانی کہلاتے ہیں۔ انھوں نے کبھی ایسا جملہ نہیں سنا ہوگا " نی! آئیشاں اُرے آنی! تینوں دساں ساڈھے گھر 'ہندوستانی' آئے ہوئے ہیٹ " اری! عائشہ یہاں آ، ری! تجھے دکھاؤں ہمارے گھر ہندوستانی آئے ہوئے ہیں۔ نی کی تکرار نے جو لطف پیدا کیا ہے بیان سے باہر ہے، مطلب یہ کہ اشتیاق اور تعجب کا اظہار جس شدت سے ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ہندوستانی' چڑیا گھر کی کوئی عجیب الخلقت ہستی ہے اور گاؤں بھر کے لئے ایک دلچسپ تماشہ۔

اگر سرسری طور پر بھی ملک کا لسانی جائزہ لیا جائے تو کام کی مشکلات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آسکتی ہے کہ ملک میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں جو باشندگان ملک کی مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں کتنی زبانیں اپنی تحریر کی مالک بھی ہیں اور ان حالات میں کسی زبان کو ملک کی قومی زبان قرار دینے کا سائنٹفک اصول کیا ہوگا۔

یہ جائزہ سرحد سے شروع کیجئے، پشاور کوہاٹ، بنوں ڈیرہ

۱؎ سندھی رسم الخط کے مطابق

وغیرہ میں پشاوری کوہاٹی - بنوں چی، ڈیرہ والی مقامی اور علاقائی زبانیں ہیں اگرچہ دریائے اٹک کے تمام مغربی علاقے کی زبان پشتو یا پختو ہے جو لب و لہجہ کے قبائلی اور علاقائی اختلاف کے باوجود تمام مغربی علاقے، یہاں تک کہ حدود افغانستان تک بلکہ خود افغانستان میں بولی جاتی ہے اور اس علاقہ کی قومی زبان ہے جس کی اپنی تحریر ہے، جو خوشحال خاں خٹک اور بابا عبدالرحمٰن جیسے زبردست قادرالکلام اور صاحب مسلک شعرا کی پرجوش معنی آفرینی، درسِ عمل، قومی غیرت، آزادی کی تڑپ وغیرہ وغیرہ خوبیوں سے مالا مال ہے۔ تاہم عام طور پر پاکستان کے سرحدی علاقہ میں مقامی زبانیں بولی جاتی ہیں۔

دریائے اٹک یا سندھ کے مشرقی کنارے ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کے شمالی علاقہ میں پشتو اور ہزاروی دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن جیسے جیسے نیچے اتریں ہزاروی زبان زیادہ اور پشتو کم ہوتی جاتی ہے، واضح ہو کہ اس علاقے کے پشتون ہزاروی کو ان کو، یا اندکو کہتے ہیں، تحصیل مانسہرہ کے اندر ہی پشتو ختم ہو جاتی ہے اور تحصیل ایبٹ آباد سے ہزاروی زبان شروع ہوتی ہے اور تحصیل ہری پور میں آکر اپنا لب و لہجہ

چھاچھی زبان کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے اور آگے بڑھ کر کیمبل پوری لب و لہجہ شروع ہو جاتا ہے جو تمام علاقہ کیمبل پور کو محیط ہے۔

ضلع ہزارہ کے بعد اٹک کے مشرقی کنارے پر میانوالی، نوشاب، بھیرہ وغیرہ علاقے ہیں جن کی زبان کہنے کو تو پنجابی ہے لیکن اس کا لب و لہجہ اہل پنجاب کو بھی چونکا دیتا ہے، انتہائی کرخت اور بے ہنگم، پنجابی زبان کے سامنے اسے پنجابی کہنا زیب نہیں دیتا۔ قریب قریب جہلم تک کا علاقہ اسی لہجہ سے متاثر ہے کوہ مری سے لے کر راولپنڈی اور کم و بیش گوجر خاں تک، دوسری طرف تخمیں کاوٹہ تک پٹھواری زبان تصور کریں۔ اس علاقہ کے احساسی وجدان کا سہارا زیادہ تر مثنوی سیف الملوک ہے اس کے علاوہ تمام پنجابی تصانیف' بارہ ماسے' وغیرہ منظوم قصے محفلوں میں، اوقات فرصت کی خلا پر کرتے ہیں۔ کوئٹہ کی زبان بلوچی آمیز پشتو اور سرحد کی مقامی بولیوں کا ایک مرکب ہے۔

جہلم کے زیریں علاقہ ضلع سرگودھا سے خالص پنجابی زبان شروع ہوتی ہے اور جیسے جیسے جنوب کی طرف اتریں اس کی شستگی اور لطافت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس علاقہ کی زبان بلاشبہ جدید پنجابی کہی جا سکتی ہے، سیال جھنگ مگھیانہ کے علاقے ٹھیٹ

پنجابی کے علاقے ہیں۔ وارث شاہ کا لازوال شاہکار ہیر رانجھا اسی علاقہ کی زبان کا حصّہ ہے جو تصوف کے دقائق اور عشق و محبت کے والہانہ جذبات سے مملو ہے اور وارث شاہ کے تبحر، حرارتِ قلبی اور آشوب انا کی جگر گدازی کا معدن ہے۔ یہ تصنیف آج بھی دیہات کے باشندوں کے اوقات فرصت ہیں ان کی وجدانی تسکین کی روح و رواں ہے۔ اس کے علاوہ سوہنی مہینوال اور سسی پنوں جیسے اور بھی بیسیوں منظوم و منثور قصّے منظوم مذہبی کتابیں مثلاً "نور نامہ" وغیرہ دیہات کے وجدانیات کا احاطہ کرتی ہیں۔ پنجابی زبان کے اثرات ایک طرف منٹگمری کے علاقہ تک اور دوسری طرف دریائے ستلج کے مغربی کنارے تک پھیلے ہوئے ہیں۔

منٹگمری سے نیچے پنجابی اور سرائیکی کے مرکب ملتانی زبان کا علاقہ ہے ملتانی زبان، عظیم فاضل بابا غلام فرید جیسے متبحر صوفی اور ان کی پیروؤں کے رشحات قلم سے سیراب ہے یہ زبان جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

بلوچستان کی زبان بھی اپنی مخر بر رکھتی ہے نیز وقت کے تقاضوں اور اپنی گیرائی کے مطابق ضروری لوازلام سے آراستہ ہے

اسی طرح بروہی بھی ان زبانوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ سندھی شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ عمر ماروی وغیرہ کے ادب کی برکات سے قدیم روایات کی حامل بھی ہے نیز جدید رجحانات سے بھی بے بہرہ نہیں۔ اپنے ادبی سرمایہ کے لحاظ سے خاص مقام رکھتی ہے۔

بنگالی زبان کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان ہندوستان کے وجود سے دونوں حصّوں میں دو ہزار میل کا بعد پیدا ہوگیا؛ اس کے علاوہ بنگال پاک وہند سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہے چناں چہ اس بنا پر تہذیب تمدّن وثقافت معاشرت ہر لحاظ سے منفرد کہا جاسکتا ہے۔ بنگالی زبان علاقائی طور پر اپنی ہمہ گیری کے باعث کسی بھی دوسری زبان کی محتاج نہیں دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کسی حیثیت سے پیچھے نہیں۔

پاکستان کی علاقائی زبانوں میں بنگالی، سندھی، بلوچی، بروہی۔ پنجابی، اور پشتو ایسی زبانیں ہیں جن کا ادب استحانی وجدان کی سیری کردیتا ہے ان زبانوں کے قدیم منظوم ومنثور اساطیر زبان زد خاص وعام ہیں جو صدیوں سے روائتی طور پر ایک سے دوسرے کو پہنچے آرہے ہیں۔ خاص طور پر منظوم ادب عوام کی فرصتی محفلوں کی جان ہے اور چنگ ورباب کی ہم آہنگی سے اس کا کیف دوچند سہ چند ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ لسانی وجدان ایک دوسری کشش ہوتی ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچنے میں استحسانی وجدان سے کسی طرح کم نہیں، لسانی وجدان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں پنجابی زبان کے ایک پرانے شاعر رحیم بخش کا ایک شعر :-

کی دیں جواب اس شاہ تائیں جدی دولت نوکھیت کرا بیٹھوں
رحیم بخش سوداگر بن آیوں چور 'ہٹیا' مفت سدا بیٹھوں

مطلب اے رحیم بخش تو سوداگر بن کر آیا تھا اور مفت میں چور ہٹیا کہلا بیٹھا بتا کہ اس شاہ کو کیا جواب دے گا جس کی دولت کو تو کھیت کرا بیٹھا ہے۔ کھیت کرا بیٹھوں کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں بادشاہ لوگ جس سے ناراض ہو جاتے تھے اسے ایک سزا یہ بھی دی جاتی تھی کہ اس کی جائے رہائش وغیرہ کو منہدم کر کے اس پر ہل چلوا دیا جاتا تھا۔ اور زمین کو کھیت میں بدل دیا جاتا تھا۔ چنانچہ کھیت ہو گیا اردو میں بھی مستعمل ہے اور دیہات کے لوگ اکثر ایسے موقع پر 'کھیت ہو گیا' بولتے ہیں۔ جب کوئی سخت نقصان ہو جائے۔ اس شعر کی جان لفظ 'ہٹیا' ہے جس کا ترجمہ یا مطلب بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور لسانی وجدان اسی لفظ میں پوشیدہ ہے۔ دبٹ

سندھی حروف تہجی کے قاعدہ پر لکھا ہے جو ہندی اڑاں کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔

پشتو زبان کے مشہور شاعر بابا عبدالرحمٰن کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

بلبلا نو په سه نعره وہی رحمانو
د بہار گلو نا شوے دے که ندے

اے رحمان بلبلیں کس لئے نعرے لگا رہی ہیں (زندہ باد مردہ باد والے نعرے نہیں)، یہاں 'نعرہ' سے مطلب 'نالہ' ہے، دوسرے مصرعہ کا مطلب ہے، پھولوں پر بہار آئی کہ نہیں۔

لیکن اردو کے اس ترجمہ نے پشتو زبان کی خوبی ختم کردی جسے میں لسانی وجدان کا نام دے رہا ہوں بلبلان کے لون کے ساتھ واؤ کے شمول سے جو صوتی لطف پیدا ہوتا ہے، اور رحمان کی 'ح' کا تلفظ 'خ' میں ادا کرنے سے جو بات پیدا ہوتی اس سے صرف پشتون ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح گلونا کا الف زائد اگر خارج کر دیا جائے تو پشتو کے لسانی وجدان کا خون ہو جائے گا جبکہ مزے کی بات یہ ہے کہ عام بول چال میں پھول کے لئے گل بغیر الف زائد کے استعمال ہوتا ہے۔

ملتانی میں بابا فرید کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

حق و باطل سب حق و حق ہے

پر ایہہ راز بہوں مغلق ہے

مطلب :- حق اور باطل سب حق ہی حق ہے لیکن یہ راز بہت مغلق (عمیق گہرا) ہے۔ کیا اردو زبان کے اہل تصوف میں یہ جراءت کہیں آپ کے مشاہدہ میں آئی اس میں جو انتہا پسندی پائی جاتی ہے اور اس سے جو کیفیت ایک علاقائی صاحب حال کو حاصل ہو سکتا ہے اس کا اندازہ مشکل، حق ہی حق اور حق و حق کے لطف زبان میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

ایسی ہی دوسری خصوصیات ہر زبان میں علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں جن سے سامعہ بچپن میں مانوس ہو جاتا ہے پھر اس میں تبدیلی مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے اور ذہن تمام عمر ان خصوصیات سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ اسی امر کو میں نے لسانی وجدان سے تعبیر کیا ہے۔ زبان کا لفظ لفظ اس خاک کے اثر میں رچا ہوتا ہے جس پر انسان مٹی میں لوٹ کر کیچڑ میں لتھڑ کر پروان چڑھتا ہے۔ بچپن کی زبان کا گھلاوٗ اور

لوچ از مہد تا لحد اس کا دامن گیر، اور اس کا چھوڑنا گوشت کا ناخن سے جدا ہونا۔

اس اعتبار سے ملک کے عوام کی بہت بڑی اکثریت کا، جو دیہات میں بستی ہے، تسکین وجدان، نیز علاقائی یا روز مرہ ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے اردو زبان سے، دلچسپی لینا مشکل ہے، اور ایسے ماحول میں جہاں، گھروں، محفلوں مجلسوں میں علاقائی زبانیں ہی بولی جاتی ہوں اردو کا پائیدار یا متوقع اثر و نفوذ معلوم!

صرف پنجاب ہی ایک ایسا علاقہ ہے، جسے اس زبان سے ہمیشہ وجدانی تعلق رہا ہے، وہ بھی کیسا کہ اہل پنجاب، نے اپنی مادر زبان کے تمام حقوق اس گھری پڑی زبان پر نچھاور کر دیئے۔ چنانچہ ایک عرصہ سے پنجابی زبان "ہیر رانجھا" جیسے ادبی شاہکاروں سے خالی ہے۔ یہ قربانی بڑی عظیم قربانی ہے اور پنجاب کا ہر ادیب ہر صحافی ہر انشا پرداز ہر صاحب قلم مختصر یہ کہ ہر وہ فرد جو صرف خط اردو میں لکھتا ہے شایان شان احترام کا مستحق ہے۔ پنجاب اس زبان کی نشر و اشاعت میں قیام پاکستان سے قبل بھی پیش پیش تھا اور اس کے صدر مقام لاہور سے جو سوتے

پھوٹتے تھے، دکن اور بنگال تک تشنگان وجدان کی تسکین کرتے تھے اور آج بھی اس کا وہی عالم ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد اگرچہ کراچی لاہور کا مدِ مقابل بن رہا ہے لیکن لاہور کا مقام اپنی جگہ پر ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں اس زبان کی بقا کے واحد علمبردار اہل پنجاب ہیں اگر انہوں نے پہلے سے اس زبان کو اپنا نہ لیا ہوتا تو آج اس کا وجود ہی معرض خطر میں تھا۔

اس جائزہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اردو سے ملک کے علاقائی باشندوں کو وجدانی تعلق نہیں صرف کاروباری یا معاملاتی تعلق ہے۔ ایسی حالت میں اس زبان کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلانے کے منصوبے، قوم کی بے اعتنائی کا رونا، توقعات باندھنا، بے سود جب تک کہ زبان کا نام خود قوم کو اپنی طرف کرنے کا ضامن نہ ہو۔

یہاں میں پنجاب کے اردو داں طبقہ سے ایک دردمندانہ اپیل کئے بغیر نہیں رہ سکتا یعنی یہ کہ وہ اولین لمحہ ہیں، اپنی روزمرہ زندگی، بے تکلف احباب کی مجالس، گھریلو زندگی غرضیکہ گفت و شنید کے ہر نقطہ پر بھی اس زبان کو اپنالیں

اور نہ صرف شہروں بلکہ پنجاب کے ایک ایک قریہ میں اس زبان کو عام کرنے کے لئے نشر واشاعت، رضاکارانہ تدریس اور ایسے ہی ہر ممکن ذریعہ کو کام میں لائیں اور بہت قلیل عرصہ میں تمام اندرونی علاقہ کے بھائیوں کو اس بے نظیر زبان کے فیض سے بہرور کرنے کا فریضہ ادا کرنے کا تہیہ کرلیں۔ یہ جدوجہد اس زبان کو نہ صرف قومی زبان سمجھ کر شروع کریں، بلکہ اسے اپنی مادری زبان سمجھتے ہوئے ہر قدم اٹھائیں۔ جبکہ یہ کھلی حقیقت ہے کہ وہ ایک طویل زمانہ سے اپنی مادری زبان کو ثانوی درجہ دیئے ہوئے ہیں اور ان کا تمام علمی اور ادبی سرمایہ اس زبان میں منتقل ہوچکا ہے اور یہ زبان ایک مسلّمہ حقیقت کے طور پر ان کی اپنی زبان یا دوسرے لفظوں میں ان کی مادری زبان ہوچکی ہے اردو کا تسمیہ 'پاکستانی' سے بدل دینے پر پنجاب 'پاکستانی' زبان کا جگر بن جائے گا۔

دوسری طرف اہل دہلی اور لکھنؤ سے بھی یہ توقع ہے کہ وہ پاکستانی زبان سے متعلق نئی تبدیلیوں سے وحشت نہ کریں اس کا علاج ناک بھوں سکیڑنا نہیں ہے، استہزا نہیں ہے، فقرے چست کرنا نہیں ہے، تدبر اور علوئے نفس سے ایسی باتوں

کو دور کا واسطہ بھی نہیں۔ ایسا کرنے والے ان بزرگوں کے نام کو بھی ڈبو رہے ہیں جن کی عزت و توقیر کی غیر زبان افراد کے دلوں میں بھی گنجائش ہے۔ یہ تبدیلیاں قیام پاکستان کا لازمی نتیجہ ہیں۔

ملک کے علاقائی باشندے اور وہ بھی یکسے جن کی مادری زبان، پشتو، سندھی، بنگالی، پنجابی، بلوچی، بروہی وغیرہ وغیرہ ہو، اس بات کو کیا جانیں کہ محاورہ کس کھیت کی مولی اور روزمرہ کس باغ کا بتھوا ہے۔

زبان ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ کسی مخصوص خطۂ زمین (ملک) کے باشندے ایک دوسرے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، اپنا مافی الضمیر واضح کرتے ہیں یا آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ کسی زبان کو ملک کی قومی زبان قرار دینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زبان ملک میں اپنے بولنے اور سمجھنے والوں کا ایک وسیع دائرہ رکھتی ہو، یعنی اگر علاقائی اقوام کی زبانیں بھی کسی ملک میں موجود ہوں تو ان کے مقابلے میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہو۔

وجدانیات کی علاقائی تسکین تو بے شک علاقائی زبانوں

سے ہو سکتی ہے لیکن معاملاتی امور کی تشفی کے لئے ملک میں ایک ایسی زبان کا ہونا ہر اعتبار سے ایک منطقی مطالبہ ہے جو ملک گیر ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو یا ایسے امکانات کی حامل ہو جو اُسے جلد از جلد کل ملکی حیثیت دے سکیں "دو زبانی حل" سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا، نہ منطقی طور پر قومی اور ملکی سالمیت ثابت ہوتی ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان بھارت کے وسیع علاقہ نے اس مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ بنا رکھا ہے۔

یہ تجویز کہ مشرقی پاکستان میں اردو اور مغربی پاکستان میں بنگالی کی تعلیم کو اہمیت دی جائے قوم کے عجز ادراک دلیل ہے یہ تجویز اپنی جگہ پر بہت مفید ہے لیکن قومی زبان کے مسئلہ کا حل ہرگز نہیں۔ ایسا کرنے سے بھی کل ملکی زبان کا مسئلہ اپنی جگہ پر حل طلب ہی رہے گا۔ اس عمل نیز دوسری زبانوں کی آمیزش سے جو مرکب تیار ہو گا وہ تو پہلے ہی سے متوقع ہے پھر جب آخرکار یہی ہونا ہے تو کیوں نہ اردو کا تسمیہ، جو ملک میں تمام زبانوں سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، "پاکستانی" قرار دیا جائے اور کل ملکی قومی زبان کا بھرم قائم کر کے اس نامربوطیت کا خاتمہ کر دیا جائے!

ملک؟ پاکستان، قوم ہم پاکستانی، زبان اردو !!!

آئیے میں آپ کو آنے والے پاکستان کی ثقافت اور زبان

کی چند جھلکیاں دکھاؤں جس کا ابھی صرف خمیر تیار ہو رہا ہے ملک کے ریڈیو سے دن رات پشتو پنجابی نیز دوسری علاقائی دھنیں نشر ہوتی رہتی ہیں جن کے بول پاکستانی ہوتے ہیں ان دھنوں کے ساتھ کامل مطابقت پیدا کرنے کے لئے ایسے الفاظ بھی شامل کر لئے جاتے ہیں جو پاکستانی زبان کے نہیں ہوتے بلکہ علاقائی زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً "دلدارا!" جو الف ندائیہ کے ساتھ خالص پشتو زبان کا لفظ ہے اور ٹیپ کے بول کے آخر میں آتا ہے۔ "یا قربان"! بعض پشتو ابیات کے آخر میں آتا ہے۔ "ماہی وے" پنجابی 'ماہیا' کی مستزاد سمجھ لیں، ایسے ہی دوسری علاقائی دھنیں مثلاً سندھی بنگالی مفرد مرکب نشر ہوتی رہتی ہیں۔ نئی نسل نے کہنا مصدر کا استعمال تقریباً ترک کر دیا ہے اور اس کی جگہ بولنا مصدر رواج پکڑتا جا رہا ہے جو کہ سندھی بنگالی گجراتی وغیرہ اثرات کا نتیجہ ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے ایسی گاڑی کے لئے جس کے کل پرزے ڈھیلے ہو گئے ہوں اور چلنے میں کھڑ کھڑ کرتی ہو چھکڑے کی جگہ 'کھٹارا' استعمال کرنے لگے ہیں۔ ایک اشتہار ملاحظہ ہو۔

" کارخانہ چالو حالت میں برائے فروخت "

فرمائیے "چالو" کے متعلق کیا رائے ہے کہئے' چلتی حالت میں، رواں حالت میں، جاری حالت میں، کام کرتی حالت میں،

کہے جایئے ، اس معنی میں کوئی لفظ چالو نہیں ہو سکتا، چالو چلے گا اور کسی کی نہیں چلے گی۔

میرے ایک بہاری دوست ، نام نہ پوچھئے گا، ثانوی مدرسہ میں طلبہ کو پڑھاتے ہیں نمونۂ کلام ملاحظہ ہو" کیا بولا ارے بہ "ڈھولا آتا ہے دروازہ بند کرو"۔ ایک اور بزرگ دکن سے تعلق رکھتے ہیں اکثر طلبا کو تلقین فرماتے رہتے ہیں "پڑھتے پڑھتے! پڑھتے پڑھتے !!" ایک بنگالی صاحب پچھ دریافت فرماتے ہیں، "شودر کون شا بوش جانیکا" ان کے منہ سے لفظ شودر نکلتے ہی ذہن ہندوستان کے شودروں میں الجھ گیا اور پہلے ثانیہ میں جواب دینا دشوار ہو گیا، فوراً ہی "کون شا بوش جانے کا" ذہن میں آ گیا اور سنبھل کر انہیں بتایا گیا کہ فلاں بس صدر جائے گی۔ ایک صاحب بس میں سوار ہوئے گھبرا کر کنڈکٹر کی طرف اکنّی بڑھائی ارشاد ہوا" ایک آنہ کی مجھے بھی دینا" بس میں قہقہے بلند ہوئے کنڈکٹر بھنا کر رہ گیا۔ بیچارے جھینپ گئے ۔ کیا یہ سب لوگ پاکستانی نہیں بول رہے ہے ؟

اس تمام ملغوبہ کو قومی زبان تسلیم کر لیں اور بولنے والوں کو "اہل زبان" ، لیجئے قومی زبان بولنے والوں کی اکثریت ہو گئی اور تمام علاقائی زبانوں سے زیادہ بولی جانے اور سمجھی جانے والی زبان ہو گئی جو پہلے ہی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے ۔ پاکستان ملک اور

پاکستانی قوم کی رعایت سے اس کا تسمیہ بدلکر پاکستانی کردیجئے، اہل زبان اور غیر اہل زبان کا نفرت انگیز امتیاز ختم کیجیے، اور بہت جلد کیجیے ملک بھر میں تمام کاروباری سیاسی، معاشرتی دستاویزات کے لیئے، جن میں، قومیت کی خانہ پری ہوتی ہے، پاکستانی لکھنا قانون میں شامل کردیجئے کسی علاقائی قوم سے احتجاج کیئے بغیر کچھ ہی عرصہ میں پاکستانی کل ملک کی قومی زبان بن جائے گی یہ وقت کی پکار ہے جسے بلا تخصیص اہل زبان اور غیر اہل زبان تمام اردو والوں کو سمجھنا چاہیئے، پس وپیش کرنے کا موقع نہیں

بلاشبہ ہر رطب و یابس کی ملاوٹ سے زبان کا حسن جاتا رہے گا اس کی نوک پلک سنوائے ہیں ہم نے صدیاں صرف کی ہیں لیکن "بھائی" ولی دکنی اور سعدی دکنی کی زبان جب غالب اور اقبال کی زبان بن گئ تو اس دور میں جب کہ بمقابلہ ولی اور سعدی کے زمانہ کے ہمارے پاس بہتر سے بہتر ذرائع موجود ہیں۔ زبان کے سدھارنے میں کون سی مشکلات ہوں گی۔ تاہم اس خیال کو دل میں رکھئے کہ "دوسری زبانیں بولنے والوں سے سابقہ پڑنے پر زبان میں ردوبدل ضروری ہے۔" زبان کوئی جامد شئے نہیں ہوتی یہ ایک نامی اور ارتقا پذیر مظہر فطرت ہے۔ قدرت کے کارخانے میں ہر چیز بدلتی رہتی ہے۔ زبان بھی

فطری اسباب و عوامل کے تحت تغیر و تبدّل کے مختلف مراحل طے کرتی اور نت نئے قالب میں ڈھلتی رہتی ہے۔ انسان لاکھ کوشش کر کے بھی اسے قواعد و ضوابط کے شکنجوں میں نہیں جکڑ سکتا۔ اس کا دھارا اپنی رفتار سے بہتا رہتا ہے اور یہ آگے بڑھتی رہتی ہے جس زبان سے یہ خصوصیت ختم ہو جائے وہ اوراق پارینہ بن کر رہ جاتی ہے۔ زندہ زبان ماحول اور حالات کا اثر قبول کرتی ہے۔ زبان کے دوسرے جاننے والوں کو اہل زبان نہ سمجھنا سخت ناانصافی ہے" ماخوذ از، فکر و خیال، از ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

یہاں اب مرے ہم زباں اور بھی ہیں

مختلف تغیرات کے زیر اثر زبان میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ملک کے جس علاقہ یا شہر میں علماء، ادبا، شعرا اور دیگر اہل علم و فن جمع ہوتے ہیں وہاں نشر و اشاعت، ادبی مجالس، تعلیم یافتہ افراد کے رسمی اجتماعات نیز مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی تقریبوں کی تمام ہماہمی کے محرک مہذب اور متمدن افراد ہوتے ہیں عوام سے ان کا معاملہ گفت و شنید تعاونی اشتراک جیسے عوامل ہی علاقہ کے عوام کی زبان پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ پھر لکھنؤ کی بھنگنیں لڑیں اور ایک دوسری کو یوں گالیاں دے "اس موئی کی روزانہ کی چخ چخ نے میرے دل کو خانۂ زنبور بنا دیا ہے" تو اس شان تکلم میں کیسے کلام ہو سکتا ہے

یہ باتیں سکون کے زمانہ کی ہیں، آج جب کہ "توے کی تیری نمگاری کی میری" کا عالم ہے ان باتوں میں الجھ کر جی جلانے سے کیا حاصل جب مناسب ماحول قائم ہو جاتا ہے تو کچھ مدّت گزرنے کے بعد زبان میں ایسی صلاحتیں خود بخود بروئے کار آجاتی ہیں جو اس علاقہ یا شہر کی زبان میں بمقابلہ ملک کے دوسرے علاقوں کی زبان کے ایک نمایاں فرق پیدا کر دیتی ہیں، تعاونی تقاضے اس کو جلا دیتے رہتے ہیں، زبان کا رنگ روپ نکھرتا رہتا ہے، قدیم و جدید کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ سعدی دکنی "تم دل لیا اور دکھ دیا" نظم کرتا ہے اور بڑے فخر سے اس کو شیر و شکر آمیختہ، کہتا ہے لیکن آنے والی نسلیں اس کے شیر و شکر سے منہ بناتی ہیں۔ نسیم دہلوی دعوی کرتا ہے۔

کوئی اردو کو کیا سمجھے کہ جیسا ہم سمجھتے ہیں

اس مصرعہ میں کوئی کو کیا کہ باب فصاحت نہیں الواب فصاحت ہیں کا سمجھے کاخ فصاحت اور بقول اقبال ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے!!

اب تک جو علمی ذخیرہ اس زبان نے مہیا کیا ہے اس پر تشکیل اور ترکیب کے نقطۂ نظر سے ایک سرسری نظر ڈالئے اور اس امر کی نشاندہی کیجیے، کہ پونے دو سو برس سے کچھ زیادہ کے عرصہ میں

ایسا کوئی دور گذرا ہے۔ جس میں زبان کے بگڑنے کا خطرہ لاحق ہوا تھا (جنہوں نے قصداً اس زبان کو بگاڑا ہے اس کا خمیازہ بھی وہ جلد ہی اٹھانے والے ہیں) پھر اگر ایسا نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے تو اب کیوں گردن میں ہول دلی آویزاں کی جا رہی ہے اور اس سٹپٹانے کا کیا مطلب؟ پھر پاکستان میں گذشتہ چند سال نے تو ایسے ایسے "پیارے" لکھنے والے پیدا کئے ہیں (نام لینے سے لطف جاتا رہے گا) کہ بجا طور آئندہ نسلوں کے لئے مایہ فخر و مباہات کہے جا سکتے ہیں۔ اور یوں تو خود مولوی عبدالحق نے قواعد اردو صفحہ ۱۲۸ پر تحریر فرمایا ہے۔

"زبان میں افعال اور دیگر اجزائے کلام کے متعلق وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اہل علم، ادبا، شعرا نیز تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت سے کسی خاص شہر کی زبان میں ایسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں جو وہاں کی زبان کو ملک کے دوسرے علاقوں کی زبان سے ممتاز کر دیتی ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پھر وہاں زبان خاص کا طوطی بولنے لگ جاتا ہے، بلکہ جہاں خواص کی انہیں مرکز کی طرف کھینچتی ہیں وہاں عوام کی احتیاجیں بھی انہیں کشاں کشاں اسی طرف رخ کرنے پر مجبور کرتی

ہیں چنانچہ ملک کے گوشے سے مزدور کاریگر اور ایسے ہی دوسرے افراد کھنچے چلے آتے ہیں اور ان کی تعداد بھی تعلیم یافتہ طبقہ سے نسبتاً کہیں زیادہ ہوتی ہے ان کے خلط ملط اور لب و لہجہ کے خود کار عمل سے بھی زبان محفوظ نہیں رہ سکتی، چنانچہ دہلی کی فصیح کیا بلکہ افصح زبان کے ساتھ ہی خاص دلی کے کرخنداروں (کارخانہ داروں) کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو" لمڈا صفیلوں ہیں گھوم رہا تھا میںنے کا ورے آ! تو وہ اور پرے لپکا۔ ہیں نے پھر آواز دی۔ ابے ...... گالی.. آریا ئے کہ نئیں! پھر جو قریب آیا، تو میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ لپڑ دیا کہ... گالی.. ... کے حواس فاختہ ہو گئے، اس جملہ کی وجہ تصنیف بھی سن لیجئے؛

کارخانے ہیں کام کرنے والا ایک لڑکا شہر کی فصیل کی طرف جا نکلا وہاں کارخانے کے کسی ذمہ دار فرد نے اسے دیکھ لیا (فصیل چونکہ سنسان پڑی رہتی ہے۔ اس لئے لڑکوں کا اس طرف جانا اچھا نہیں خیال کیا جاتا) بلانے پر وہ پٹائی کے خوف سے اور آگے بھاگا۔ جب دھمکی دی گئی تو اسے ناچار واپس آنا پڑا۔ قریب آنے پر ایک تھپڑ اس زور سے مارا کہ حواس باختہ ہو گیا۔ فصیل کا صفیل اور پھر وہ بھی صیغہ جمع، تھپڑ کا لپڑ۔ ادھر کا ورے ادھر کا پرے اسی طرح آرہا کی جگہ آریا جارہا کی جگہ جاریا، کس نے کا بدل کنے اس نے کا بدل انے۔ وغیرہ وغیرہ!!

چنانچہ اگر دہلی کے خواص کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر جو زبان آپ دلی والوں کی سنیں گے اُسے آپ جو چاہیں کہیں لیکن خواص کے نزدیک وہ سوقی زبان ہو گی، بات ماننے کی ہے، لیکن یہ سوقی بولنے والے اہل زبان کے زمرے سے خارج نہیں کیے جا سکتے جب تک دہلی کا ستارہ اوج پر رہا دہلی کی زبان مستند رہی۔ دہلی کے اجڑنے کے بعد لکھنؤ کی زبان مستند ہو گئی تاہم چشمک دونوں طرف سے جاری رہی، اور اب نہ دہلی ہے نہ لکھنؤ، پان میں چونا جا ستی مارو۔

زبان میں تبدیلی امتداد زمانہ کے ساتھ لازمی بات ہے ذرا فارسی اور عربی کی درگت پر غور کریں اور دیکھیں کہ زمانہ نے ان دونوں زبانوں کا کیا حلیہ بنایا ہے اور اپنی زبان کے متعلق یقین رکھیں کہ اسے اس قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں۔

آج اگر شیخ سعدی اور خواجہ حافظ زندہ ہوتے تو جدید فارسی کو سن کر سر پیٹ لیتے، روسی، فرانسیسی، جرمنی، انگریزی الفاظ مفرس ہو کر جزو زبان بن چکے ہیں چنانچہ استاسیوں، تلغراف، پُست، جیسے الفاظ تو عام بات ہے لیکن بعض مفرس الفاظ ایسے ہیں کہ پڑھ کر یا سنکر بغلیں جھانکنی پڑیں۔ ملاحظہ ہو دگمہ انگریزی

لفظ DOGMA کی "بگڑی" ہے شارلتان بافی، اوٹ پٹانگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، شارلتاں فرانسیسی کے خیالات کی بھد اڑائی گئی ہے۔ شارلتاں کے نام کے ساتھ بافیدن مصدر سے بافی شامل کرکے ایک نیا لفظ بنا لیا ہے۔

یہ تو غیر زبان سے لئے ہوئے الفاظ کا معاملہ ہے۔ فارسی کے اصل روزمرہ میں تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ چنانچہ تشریف رکھنے کیلئے "بفرمائید"، "میدانم" کی جگہ "خبر ہستم"، کلمہ نفی "نہ"، "نیست" کا بدل "خیر" استعمال ہوتا ہے اور ایسی ہی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں مختصر یہ کہ سعدی اور حافظ کی زبان ان کے ساتھ گئی حالیہ دور ملک الشعرا بہار کی زبان کا دور ہے اور یہی درست ہے۔

اسی لحاظ سے عربی فارسی سے چار ہاتھ آگے ہے ایک زمانہ میں عربوں کو زبان کی صحت کا بڑا خیال رہتا تھا لیکن جب اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں ان کے عسکر غیر ممالک کو نکلے تو صورت حال دگرگوں ہو گئی اور صحت زبان کا سارا اہتمام دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ لطیفہ یاد آ گیا ہے۔ محض حافظ کے بھروسے پر لکھ رہا ہوں سہو کے لئے اہل نظر سے معذرت خواہ ہوں۔ صاحب قاموس مجدالدین بن یعقوب فیروزآبادی کی فصاحت و

بلاغت اور زبان دانی کے دھوکے میں عربوں نے اپنی بیٹی بیاہ دی ایک رات جب میاں بیوی سونے لگے، تو چونکہ چراغ بیوی کی طرف سے قریب تھا میاں نے بیوی سے کہا " اقتلی السراج[1] مجدالدین کے منہ سے یہ الفاظ نکلنے تھے کہ بدوزادی تڑپ کر بستر پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی - انت عجم انت لا عرب اور صاحب قاموس جیسی شخصیت پر گھڑوں پانی پڑ گیا - اس واقعہ کو پڑھے ہوئے پچیس برس گذر چکے ہیں نوبت خلع تک پہنچی یا نہیں، یاد نہیں کیا کیا پڑھا تھا -

اس دور میں مصر کو عربی کی سرپرستی کا فخر حاصل ہے، جس کی قدیم زبان قبطی تھی، آج وہاں ما اسمک کی جگہ مسمک، جناب کی جگہ گناب بولا جاتا ہے ما کی جگہ مایہ اور جسے ہم جمال ناصر کہتے ہیں اسے گمال ناصر کہا جاتا ہے اور نہ صرف مصر بلکہ تمام عرب میں جو زبان آج کل بولی جاتی ہے قدیم عربی سے بالکل مختلف ہے چنانچہ جیسا کہ میں نے جناب اور گناب کا فرق ظاہر کیا ہے عربی اپنی صوتی خصوصیات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہے - تلفظ کی وہ اکھاڑ پچھاڑ آپ کے مشاہدہ میں آئے گی کہ بقول حکیم حیدر علی مقیم لیاقت آباد اپنی عربی دانی کے باوجود خود کو زنداں خانے میں محسوس کریں گے - ۱۹۴۸ء میں

[1] عجمی محاورہ چراغ را بکش ہے، اطفا السراج کہنا تھا

راقم الحروف کو مصر اور عراق جانے کا اتفاق ہوا تھا اس وقت کی معلومات کی بساط، میرا علم ماکیون سے ماکون تک محدود تھا حکیم صاحب موصوف سے مزید "ڈویلپمنٹ" یہ معلوم ہوئی کہ ماکون چھنٹ کر ماکو رہ گیا ہے، حکیم صاحب ۶۰ء میں ان ممالک کا دورہ کر کے آئے ہیں اور تازہ ترین ترقیات، کے شاہد ہیں چند لفظ انہیں کی زبانی اور سن لیں ۔ قل کا گل بن گیا ہے، متنا۔ متی آپ ہم سے مجھے، خال فرمانے کی غلطی کر رہے گے ۔ یہ الفاظ یہاں سے، وہاں سے کے معنوں استعمال ہوتے ہیں ۔ قیلا لہ کا گلّے رہ گیا ہے لفظ قیلا لہ کی مثلہ کاری (ناک کان کاٹنا) کا لطف بھی حاصل کیجیے، یہ لفظ پہلے تو ج اور ق کو گ سے بدلنے کے قاعدہ، کے مطابق گیلے لہ پھر صرف گیلے اور پھر گلّے رہ گیا بہر حال یہ عربی زبان ہے آپ فارسی کی طرح اسے بھی جدید عربی کہہ سکتے ہیں

مختصر یہ کہ آج جس دور سے ہم گذر رہے ہیں وہ سائنسی دور ہے ۔ زمین کا پھیلاؤ اور فاصلے سمٹ سمٹ کر انسانی ذہن کو قریب سے قریب تر لا رہے ہیں ۔ آج انسان کو ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جو آفاق گیر صلاحیت کی حامل ہو ۔ موجودہ ماہرین لسانیات زبان کو صوتیات، لفظیات، تشکیلات اور معنیات کے لحاظ سے دیکھ رہے ہیں جس میں سب سے اہم حصہ صوتیات کا ہے ۔ خیالات صوتیات میں ڈھلتے ہیں اور صوتیات زبان کی شکل اختیار کرتی ہیں ۔

چنانچہ زبان انسان کے اظہار خیال کا آلہ ہے۔ اس مفہوم کا اطلاق ہم 'لڈ بھڑول' یا اسی قسم کی چند اور مرکب یا مفرد اصوات پر بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ اس طرح کے مجموعہ اصوات سے کوئی خاص مفہوم اخذ کیا جا سکے۔ لڈ بھڑول سے آپ کوئی مطلب اخذ کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو یہ لفظ محض اصوات کا مجموعہ ہے اور اگر اس مجموعہ اصوات سے کوئی مطلب سمجھا جا سکتا ہے تو یہی مہمل موضوع کہلائے گا (لڈ بھڑول شملہ کے علاقہ میں ایک قصبہ ہے) لفظ کے لغوی معنی منہ سے باہر پھینکنا یا مطلق پھینکنے ہیں چنانچہ اگر منہ سے باہر پھینکی یا نکلی ہوئی آواز سے کوئی مطلب اخذ ہو گیا تو وہ آواز لفظ ہے زبان ہے ورنہ محض صوت یعنی صرف آواز — اسی اصول میں ایک عالمگیر زبان کے امکانات پوشیدہ ہیں۔

نہ جاننے کی صورت میں تمام دنیا کی زبانیں ابھی تک درجہ میں ہیں۔ زمین کے مختلف خطوں پر آباد انسان صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ مخصوص مطالب کے اظہار کے لئے مخصوص اصوات کا استعمال کرتا رہا، ادائے مفہوم کے لوازم اصوات کو ترتیب دیتے رہے، زبان ترقی کرتی رہی، یہ عمل ہر خطۂ زمین پر جاری رہا۔ جغرافیائی ماحول آب و ہوا اور آبائی ورثہ نے انسان کے حلق تالو، لبوں اور زبان (بمعنی پارۂ گوشت) کے پٹھوں، غدودوں رگوں پر مختلف اثرات ڈالے اور زمین کے مختلف خطوں کی مختلف زبانیں بن گئیں۔

انسان جس قدر تہذیب و تمدّن علوم و فنون، ایجاد و اختراع میں ترقی کرتا گیا اسی قدر اس کی زبان میں بھی ترقی ہوتی گئی، متمدن زندگی کے لوازم نے معانی و مطالب میں نفاست لطافت، نزاکت پیدا کی ادائے مطلب اور اظہار جذبات کے نئے نئے اسلوب پیدا ہوئے شعر کی تخلیق ہوئی، تحریر ایجاد ہوئی نظم کے دوش بدوش نثر میں ترقی ہوئی، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، ایجاز و اطناب کا اہتمام ہوا، زبان میں صنعت کاری کے گل کھلے، فصاحت و بلاغت کے باب کھلے۔ تصنیفات و تالیفات کا آغاز ہوا۔ مختصر یہ کہ کسی خطۂ زمین کے انسانوں نے جس قدر زیادہ علمی، فنی، تہذیبی، تمدنی، ایجادی، اختراعی ترقیاں کیں اسی قدر وہاں کی زبان نے بھی نشو و نما حاصل کی۔ اگر کسی خطۂ زمین پر تہذیبی اور تمدنی ترقی نہیں ہوئی زبان بولی کی حد سے آگے نہیں بڑھی تو متمدّن اور مہذّب انسان کے لیے اس میں فخر کی کیا بات ہے؟ اس کے اسباب و علل پر غور کیجیے اور پھر نام نہاد و تہذیب و تمدّن کا ماتم۔

جن زبانوں میں اختراعی ایجادی، علمی، فنی ترقیات کے باعث معانی و مطالب کے اسلوب اور لفظی اصطلاحات کی کثرت تھی اُن سے دوسری زبانوں نے استفادہ کیا۔ ایک تمدّن کی جگہ دوسری تمدّن نے لی یا ایک تمدّن سے دوسرا تمدّن

پیدا ہوا تو زبان بھی اس تغیّر سے متاثر ہوتی، انسان کے نقلِ مکانی کے "شغل" نے (خواہ وہ کسی وجہ سے بھی ہو) ایک ملک کی زبان دوسرے ملک میں پہنچائی، چنانچہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہ رہی جس میں کسی دوسری زبان کی آمیزش نہ ہو۔ پھر جب ایک سے زیادہ انسانی گروہ (اقوام) ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہوئے تو ایسی زبان کا وجود عمل میں آیا جسے ہندوستانی اور بعد میں اردو کا نام دیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد ایک مرتبہ پھر اس ملک میں مختلف زبانیں یکجا ہوئی ہیں لیکن اس مرتبہ صورت حال قدرے مختلف ہے، یعنی اردو کی بنیاد کا جن تین زبانوں دکنی، سندھی، پنجابی کو دعویٰ ہے ان میں سندھی اور پنجابی مغربی پاکستان کی قدیم زبانیں ہیں، چنانچہ یہ توقع کہ اہل پنجاب کی طرح اہل سندھ بھی اس دعوےٰ کو عملی صورت میں پایۂ ثبوت تک پہنچائیں کوئی بیجا توقع نہیں۔ بلکہ دعوےٰ کی دلیل یہی ہے۔ اس ملک میں مختلف اقوام (علاقائی اور لسانی اعتبار سے) کے اجتماع کا تقاضہ ہے کہ اس مشترکہ زبان میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہوں جن کا متحمل ہونا اس زبان کی فطرت میں شامل ہے، چنانچہ اس صورت حال سے وحشت کرنا بے معنی بات ہے۔ فی الحال فعل کے صحیح استعمال، جمع واحد تذکیر و تانیث اسی طرح اسم کی تذکیر و تانیث جمع واحد وغیرہ

امور کی صحت پر توجہ دینا کافی ہوگا اگر یہ مرحلہ طے ہو گیا تو باقی مراحل خود بخود طے ہو جائیں گے۔ یہ کام صرف مضامین لکھ دینے سے نہیں ہوگا، باشعور اردو دان طبقہ کو اس زبان کا معلّم بننا پڑے گا رضاکارانہ تدریس لسان کے" مراکز قائم کرنے ہوں گے۔ کندھے پر بلیک بورڈ لادے، چاک کا بکس ہاتھ میں لئے قریہ قریہ گھومنا اور زبان کا درس دینا ہوگا۔ جب کہیں آئندہ نسلیں اطمینان کا سانس لے سکیں گی ؎

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ہمت کیجیے اور سرے دست محلہ وار لسانی مراکز قائم کر دیجئے شام کو ایک گھنٹہ بجائے دوسرے تفریحی مشاغل، کے زبان، قوم اور ملک کی خدمت پر صرف کیجئے۔ ان مراکز میں ناخواندہ نیز ایسے لوگوں کو جمع کیجیے جن کا روزمرہ ناگوار گذرتا ہے، انہیں انتہائی شفقت اور برادرانہ جذبہ سے پاکستانی سکھائیے۔ چند دن آپ کو محنت کرنی پڑے گی اس کے بعد کام خود بخود اپنے طریقے اور راستے آپ کو بنا دے گا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مصطفیٰ کمال پاشا کے ترکی جیسی روایت آپ کے پاکستان سے بھی منسوب ہو جائے گی حالانکہ وہ تنہا تھا اور یہاں سینکڑوں ہیں۔

ملک کے نوجوان طلبا کو اس مسئلہ کی نزاکت سمجھنا چاہیئے اور اس ضمن میں پہلا قدم اٹھانا چاہیئے اس لئے

کہ مستقبل کا پاکستان ان کا ہے اور اس کے مسائل سے انہیں نمٹنا ہے۔ پاکستانی زبان کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلانے کے لئے سستے طریقوں پر جدید قسم کی ناٹک منڈلیاں، رہس ٹولیاں بنائیں، تمثیلیں تیار کریں، جو علاقائی دلچسپی کا عنصر رکھتی ہوں اور مقامی زندگی کی عکاسی کرتی ہوں، ایسے ذرائع سے زبان کی نشر و اشاعت کا کام بخوبی انجام دیا جا سکتا ہے۔ چھٹیوں کے ایام میں یہ شغل سیر و تفریح نیز زبان کی خدمت، ایک پنتھ دو کاج کا لطف دے گا۔ طلبا کے ساتھ اساتذہ کی شرکت سونے پر سہاگہ ہوگی، جو ان کی نگرانی بھی کریں گے اور تدریس زبان کے بے صرف (تختۂ سیاہ اور کاغذ پنسل) مراکز قائم کرنے کی تجاویز اہل دیہات کو بتائیں گے، یہ وہ اسکیم ہے جس کے ذریعہ مصطفیٰ کمال نے ملک کے دور دراز علاقوں میں تعلیمی ذوق پیدا کر دیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی دیہات میں تعلیم بالغاں کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے جس کے لئے کسی نصاب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں آپ کی محنت اور لگن نصاب کی کمی پوری کرے گی۔ دیہات میں آپ کو ہر جگہ خوش آمدید کہا جائے گا اور آپ کی ہر مدد کے لئے لوگ دیوانہ وار دوڑ پڑیں گے تعلیم دینے کے لئے جگہ کا انتظام بلیک بورڈ وغیرہ قصبوں کے بزرگ فوراً کر دیں گے۔ صرف آپکے خلوص کی ضرورت ہے،

آج کل دیہاتوں میں بھی بنیادی جمہوریتوں کے ممبران موجود
اس قسم کے سدھار کام میں ان سے مدد لی جاسکتی ہے، ملک کے عام افراد
کو خود اپنی مدد آپ کرو کے اصول کے اپنے ساتھ شامل کر کے ملک میں
زندگی، محبت، خلوص، ایثار اور حرکت کی ایک لہر دوڑائی جاسکتی
ہے، تعلیم بالغاں کا کام آپ کو اس اندازہ پر کرنا چاہیئے کہ آپ کے
دور میں یورپ ناخواندگی سے فراغت حاصل کر چکا ہے معاشرتی فلاح و
بہبود کے کام اسی اندازہ کو سامنے رکھ کر شروع کریں کہ چین کے
باشندوں نے مکھی مچھر کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے بہت سے
ایسے کام زبان کی خدمت کے ضمن میں ہو جائیں گے۔ ملک اور قوم کے تمام
سدھار کام، حکومت کے سر ڈال دینے اس امر کی دلیل ہیں کہ ملک کے
نوجوان بے ہمت اور قومی خدمت سے جی چرانے والے ہیں۔

یاد رکھیئے جو انسان یہاں کھا پی کر نیز اپنے بعد مزید کھانے پینے
والے چھوڑ کر اور ان کے لئے کھانے پینے کا کوئی انتظام کیئے بغیر
مر گیا، وہ انسان جس نے پچھلوں کی دماغی اور جسمانی محنت سے فائدہ
اٹھایا اور آنے والوں کے لئے اپنی دماغی اور جسمانی محنت کا پھل
چھوڑے بغیر دنیا سے چلا گیا وہ انسان جس نے لا تفسدو فی الارض
کی سعی میں کوئی قدم اٹھائے بغیر موت کے سامنے سر جھکا دیا، وہ

انسان جو دنیا سے جہالت، افلاس، اور بیماری دور کرنے میں حصّہ لیا۔ بغیر راہیِ عدم ہوا، پھر وہ انسان کسی قوم کسی مذہب کسی ملک کا ہو ننگِ انسانیت ہے۔

سعدی   خجل آنکس کہ کار نساخت

کوس رحلت زد ند بار نساخت

اس انسان کا وجود اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے بھی باعث شرم ہے، پاکستان جیسے نوزائیدہ ملک کو دورِ حاضر کا معیار قائم کرنے کے لئے سر توڑ اور انتھک محنت کی ضرورت ہے۔ پر جوش سرگرم اور وطن کی محبت سے سرشار نوجوانوں کی ضرورت ہے، جو وطن سے ہر برائی ہر کمزوری دور کرنا اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں تاکہ آنے والی نسلیں دوسری قوموں کے ہاتھوں لٹنے سے بچیں اس میں کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن اور ایٹمی توانائی کا دور ہے۔ صبح و شام دنیا کے حالات آپ کے سامنے ہیں قوم اور ملک آپ کے پرخلوص عمل کا منتظر ہے!!

پاکستان میں آنکھوں کے سامنے ایسے واقعات موجود ہیں بعض گذر چکے ہیں، اور شاید آئندہ بھی ملک اور قوم کو ان سے دوچار ہونا پڑے، جو محض زبان کے تسمیہ کی بنا پر رونما ہوئے

واضح ہو کہ یہ آیت وہ جواہر پارہ ہے جس کے ضمنیات میں آج کا مہذب انسان نسلی امتیازات کے خلاف صف آرا ہو گیا ہے۔ ایسے بے شمار جواہر پارے قرآن میں بکھرے پڑے ہیں لیکن اپنے حصے میں کیا آیا فرقے! ذاتیں!! اس پر پہنچ کی باتیں!!! نسلی ذہن دور وحشت کا ورثہ ہے، مسلم کے لئے یہ تصور انتہائی بے ہودہ اور مہمل ہے، جب کہ قرآن نے اسے مرقوبالا آیت میں واحد انسانی امت کو اختلاف سے بچانے کی تلقین کی ہے۔

غیر کف سے نفرت کرنے والے اعراب نے جب یہ نکتہ سمجھ لیا، وہ جہاں گئے وہیں کے ہو گئے کیسی نسل اور کیسی قوم تمام دنیا کے انسان ایک نسل اور تمام دنیا کے انسان ایک قوم ادھر کسی نے اسلام قبول کیا ادھر یہ سب جھگڑے ختم اور مسلم کے لئے، ہر ملک ماست کہ ملک خدائے ماست کا راستہ صاف۔ ایسے ہی مسلموں کے متعلق آج غیروں کے یہاں بھی۔

THE ARAB TOURCH BEARERSOF ISLAM.

جیسی تصانیف پائی جاتی ہیں یہ ذہن اس وقت تک کام کرتا رہا جب تک کہ مسلم خیر الناس من ینفع الناس کی حکمت سے سرشار رہے لیکن کچھ ہی عرصہ میں خود مسلمانوں کی ملوکیت نے اس حکمت

عملی پرکاری ضرب لگائی اور اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا چنانچہ دورِ نبوت کا پیدا کردہ یہ ذہن رفتہ رفتہ موت کی نیند سو گیا۔ ایک نیا نظریہ سامنے لایا گیا جس کی رو سے من قتل مومن متعمد فجزاؤ ھم جہنم۔ کی تادیب کے باوجود مسلمانوں کا قتل مسلمانوں کے ہاتھ سے جائز ہو گیا۔ چنانچہ صرف عثمانؓ کے زمانہ سے حضرت حسینؑ کے زمانہ تک مسلمانوں نے آپس میں لڑکر ایک لاکھ سے زائد جلیل القدر صحابی تابعین اور تبع تابعین قتل کیے اور تاریخوں میں انہیں شہید لکھ کر اپنے خیال میں محاسبہ سے نجات حاصل کرلی۔ ایسے گستاخ اور بیہمانہ اقدامات سے اذہان انسانیت کے احترام سے محروم ہو گئے قتل و غارت کی عادت پھر عود کر آئی اور سات آٹھ سو برس آپس میں گنج شہدا بنتے رہے یہاں تک کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر یورپ کے جاگیرداروں نے "محمڈن ازم" اور کرسچینٹی، کا سوال پیدا کر کے ایک طرف تو یورپ کے عوام میں اسلام کے خلاف آگ بھڑکائی مسلمانوں کو لٹیرے، وحشی، خونخوار، عیاش مشہور کیا دوسری طرف انہیں لٹیروں وحشیوں، خونخواروں عیاشوں کے لئے اپنے شبستانوں کے دروازے کھول دئے جن میں مسخ کردہ ذہن شیوخ، امیر اور سلطان دادِ عیش میں مستغرق دنیا و ما فیہا سے غافل ہو گئے۔ میرے نزدیک

اس وقت سے اب تک مسلمان باز پرس کے میدان میں ہیں ان پر فمن یعمل مثقال ذرة خیراً یّرہٗ ؁ ومن یعمل مثقال ذرة شراً یرہٗ ؁ کا محاسبہ جاری ہے۔

اس آیت کا اطلاق پوری نسل انسانی پر ہوتا ہے، اس لئے کہ آغاز لفظ انسان سے ہوتا ہے، لفظ امت وسیع المعنیٰ ہے، کرہ ارض پر جہاں پہلے پہل نسلِ انسانی کا آغاز ہوا اُسے تقریباً ایک ہی جیسے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ اپنی ضروریات پیدا کرنا، اپنے ماحول پر غور و فکر کرنا، مشکلات پر قابو پانے کی تدابیر سوچنا، جان بچانے اور زندگی کو محفوظ رکھنے کے ذرائع ڈھونڈنا وغیرہ — وہ حالات تھے جن میں نسلِ انسانی ایک امت واحد یا بمنزلہ امتِ واحد متصور ہو سکتی ہے۔ لیکن مختلف جغرافیائی حالات میں ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے کے گوناگوں طریقے اور ماحول کی رنگارنگی سے انسان کے مشاہدہ میں مختلف تجربات آئے جن کے عوامل و مہیجات بھی مختلف تھے اور اندریں حالات نظریات وعقائد، رسم و رواج عادات و خصائل، احساسات و جذبات میں اختلاف انسان کے لئے فطری امر تھا۔ اس میں دنیا کا کوئی انسان قصوروار نہیں۔ پھر اس کا دین، یعنی طرز زندگی بھی جدا جدا ہونا چاہئے تھا۔ چنانچہ قرآن نے لا اکراہ فی الدین اور لکم دینکم ولی دین کا ارشاد فرما

کر دنیا بھر کے انسانوں کی حوصلہ افزائی کی ان کے مذاہب، مراسم مناسک، معابدہ کے تحفظ کی ضمانت فرمائی کسی پر زبردستی اپنے نظریات ٹھونس نے کے جنوں کی ہمت افزائی کبھی نہیں کی۔

کیا ایجاز کلام ہے! انسان مختلف تھے نہیں، ہو گئے ہیں، موانست انسانی کی کیسی پوشیدہ ترغیب ہے، تالیف قلوب کے تعلم کا کیا نفسیاتی طریقہ ہے، دعوت تحقیق کا کتنا جگرا اندوز انداز ہے، انسان مختلف کیوں ہو گئے، مذکور ہو چکا یہی اختلافات بڑھتے بڑھتے ملکی اختلاف، قومی اختلاف پھر مختلف نسلی اختلاف معاشرتی اختلاف، تمدنی اختلاف، اور سب کے سر پر مفاداتی اختلاف جو سب اختلافوں کو ہوا دیتا ہے۔

ان سب اختلافوں کو مٹانا بھی مسلم کے نصب العین میں شامل تھا، جنہیں مٹا کر دوبارہ امتہ واحدۃ کا قیام کرنا تھا امن قائم کرنا تھا، اسلام قائم کرنا تھا، اس لئے کہ زمین پر فساد کرنا یا کوئی ایسی بات کرنا جس سے فساد کا امکان ہو سکے مسلم کے لئے -- لا تفسدو فی الارض سے روگردانی کرنا ہے۔ اختلاف سے فساد پیدا ہوتا ہے جس سے خیر الناس من ینفع الناس کی حکمت عملی مفلوج ہو جاتی ہے اس لئے اختلاف انسان کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے اسی طرح واعتصمو بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

کی تادیب بھی آئی ہے لیکن اختلاف امتی رحمۃ کی حدیث پیش کر کے مذکورہ بالا تمام حقائق ایک ساغر غفلت کی نذر کر دئے گئے۔

واضح ہو کہ اختلاف امتی رحمۃ کے ساتھ ہی ہر اختلاف میں مشورہ کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ چناں چہ اختلاف باہم مشورہ کا باعث بنے گا۔ تنقید کی کسوٹی پر کسا جائے گا۔ اس کا جزوی اور کلی محاسبہ ہوگا مسئلہ کے تمام پہلو زیر بحث آئیں گے، ہر شخص صحیح اور غلط کو پرکھے گا اور کثرت رائے کا فیصلہ اختلاف کو رحمت بنا دے گا۔

امتی میں ایک نکتہ اور ہے، یائے متکلم اس امر پر برہان ہے کہ میری امت کا اختلاف ہی باعث رحمت ہے دوسری امت والوں کا نہیں، اس لئے کہ وہ لوگ مشورہ نہیں کرتے اور اختلاف کو خونریزی کے ذریعے منواتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس اختلاف کی بنیاد محض ذاتی مفاد اور خود غرضی پر ہو گی وہ کبھی پر امن طریقہ سے طے نہیں ہو سکتا۔ شوریٰ میں لاتے ہی اس کا بے نقاب ہو جانا یقینی ہے۔ اس وثوق پر ضمیر متکلم کا استعمال ہوا، جس کی بلاغت ضبط تحریر سے باہر ہے۔ پھر امتی کی تعریف میں وہی شخص یا فریق آئے گا۔ جس کا اختلاف باعث رحمت ہو اور جس کا اختلاف اس کے برعکس باعث لعنت ہو وہ امتی کی تعریف سے خارج ..... فقد بروا

دنیا میں مفاد پرست عناصر ہمیشہ نسلِ انسانی میں عصبیت اور منافرت پیدا کرتے رہے ہیں پوری انسانی تاریخ اس خصوص میں مفاد پرست عناصر کے ہاتھوں سے خون میں نہائی ہوئی ہے۔ بربریت کے خاکستر میں دبی ہوئی نسلی عصبیت کی یہ چنگاری کسی وقت بھی امن، اسلام، اور انسانیت کو جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر سکتی ہے اس لئے ہر متمدن انسان ہر امن پسند انسان ہر مسلم انسان کا اولین فرض ہے کہ، اس جاہلانہ جذبہ کے خلاف جہاد پر کمر بستہ ہو جائے۔

مفاد پرستوں نے منافرت کی جڑیں نسل انسانی میں بڑی گہری قائم کر رکھی ہیں۔ مذہب انسان کو آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا، لیکن مفاد پرست عناصر نے مذہبی منافرت جس شدت سے پیدا کی ہے تمام دنیا پر روشن ہے پھر مذاہب میں فرقہ وارانہ منافرت اس پر مستزاد۔ اسی طرح ملکی منافرت، قومی منافرت، رنگ و نسل کی منافرت نے واحد امت انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے،

ہندو پاک میں انگریز نے اپنے مفاد کی خاطر جس طرح منافرت پھیلائی اس کی چند مثالیں مفاد پرستوں کے عالمگیر کردار کی عکاسی کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ہندوؤں مسلمانوں میں منافرت پیدا کرنے کی ایک مثال اردو ہندی کے جھگڑے کی تفصیلات آپ نے ملاحظہ کیں، سرحد کے پٹھانوں کیے ہندوؤں کے ساتھ ہی نفسیاتی طور پر

مسلمانوں میں بھی ان سے منافرت پیدا کرنے کا کیا، ڈھنگ نکالا ہے، سر ہملٹن گرانٹ جو سرحد کے چیف کمشنر تھے، ان کے الفاظ کے مطابق ــ اگر پٹھان کو آزادی مل گئی تو ہندوستان کی کوئی لڑکی اور اس ملک کا کوئی پیسہ محفوظ نہیں رہے گا"، انگریز کے دور میں ہندوستانی مسلمان طہارت کے لئے پانی استعمال کرنے پر پٹھوار کے علاقہ میں کافر کہلوائے گئے اور اس کا جواز اس طرح پیدا کیا گیا کہ حسینؓ کو تو پانی پینے کو نہیں میسر ہوا وہ پیاسے شہید ہو گئے اور یہ لوگ، استنجأ پانی سے کرتے ہیں، اپنے مفاد کے لئے انگریز اولی الامر بن گیا، اور مسلمانوں پر ہی نہیں کعبہ پر گولیاں چلانے کے لئے ان علاقوں سے فوج کی بھرتی ہوئی سپاہیوں کے بازوؤں پر تعویذ باندھے گئے تاکہ وہ دشمن کی گولی سے محفوظ رہیں اور ان مسلمانوں نے کعبہ پر گولیاں چلائیں ... !!!

ہمارا ملک ایک قومی مملکت نہیں بلکہ کثیر قومی مملکت ہے یعنی (MULTI NATION STATE) اس میں بنگالی، پنجابی سندھی، بلوچی۔ پشتون وغیرہ قومیں عرصۂ دراز سے بستی چلی آ رہی ہیں جن کا تحت الشعوری ذہن سطور بالا کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مذہبی اشتراک کے باوصف ان کی جداگانہ ثقافتی اور

لسانی حیثیت قدیم ایام سے قائم ہے، چناں چہ ملک بھی علاقائی ثقافتوں اور زبانوں میں بٹا ہوا ہے اس لئے ہماری قومی یکجہتی اور ملکی استحکام کے راستہ میں ایک نفسیاتی رکاوٹ کھڑی ہے۔ ادھر ملک ایسی قومیت کا اقتضا کر رہا ہے جو لسانی ثقافتی نسلی ہر اعتبار سے سندھی، پنجابی، بنگالی، پشتون ذہن سے مبرا ہو، جو ذہنی طور سے صرف پاکستانی کہلانے پر فخر کر سکے۔

زبان کے لئے "پاکستانی" کا تسمیہ ملک کی تمام علاقائی اقوام میں لسانی انس پیدا کرے گا۔ دوسری طرف زبان میں نئی تبدیلیاں ایک نئی ثقافت کو جنم دیں گی جس سے عائلی یگانگت میں ہم مذاقی کی سہولت حاصل ہو گی۔ مؤانست کے حالات پیدا ہونگے۔ یہ زمانہ سندھ، پنجاب، سرحد کے ذہنی تفاوت کا نہیں ہے۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک صرف ایک ذہن کارفرما نظر آنا چاہیئے۔ علاقائی قوموں کے نسلی اختلاط کے ذریعہ تمام علاقائی اقوام کو ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا چاہیئے۔ نسلی اختلاط کی جزوی مثالیں تو اب بھی نظر آتی ہیں لیکن ان کے محرکات دوسرے ہوتے ہیں۔ ملکی حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اس عمل کو ملک کے استحکام کا ایک سائنٹی فک اصول مان کر اسی واحد محرک کی بنا پر اس کی رفتار تیز تر کر دی جائے، تاکہ لسانی، علاقائی، نسلی کھنچاؤ کے باعث پیدا ہونے

والی عصبیت اور منافرت کے راستے مسدود کرنے کے امکانات صحیح معنوں میں پیدا ہو سکیں۔

اپنی نظر میں حال یا اس برس گذشتہ کا پاکستان نہ دیکھئے گذشتہ کا ہر لمحہ ماضی کا عفریت بن کے جا رہا ہے اور ہم پھر ہر لمحہ گذشتہ اپنے گذشتہ کہنے پر مجبور ہیں دوسری طرف حال سے ہر ماضی کے بیچ والے نئے سطح پر ابھر رہا ہے جھکا ہوا مستقبل میں ڈھل رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کل ہم نے جو کچھ کیا تھا آج اس کے اثرات سے خالی نہیں۔ آج ہم جو کچھ کریں کل پر اس کا اثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا آپ کی نظر میں صرف آج نہیں بلکہ ابد تک آنے والا پاکستان ہونا چاہئے مستقبل کا پاکستان ہونا چاہئے۔ جس میں ایک نئی نسل ایک نئی ثقافت ایک نئی قوم پاکستانی نسل پاکستانی ثقافت، پاکستانی قوم ابھرے گی۔ نشوونما حاصل کرے گی۔ تنومند اور طاقتور ہو گی جس کی زبان کا نام "پاکستانی" ہونا چاہئے۔

یہ ایک مسئلہ ہے جس سے انکار ملک اور قوم کی سالمیت سے ذہنی طور پر انکار کے مترادف ہے۔
